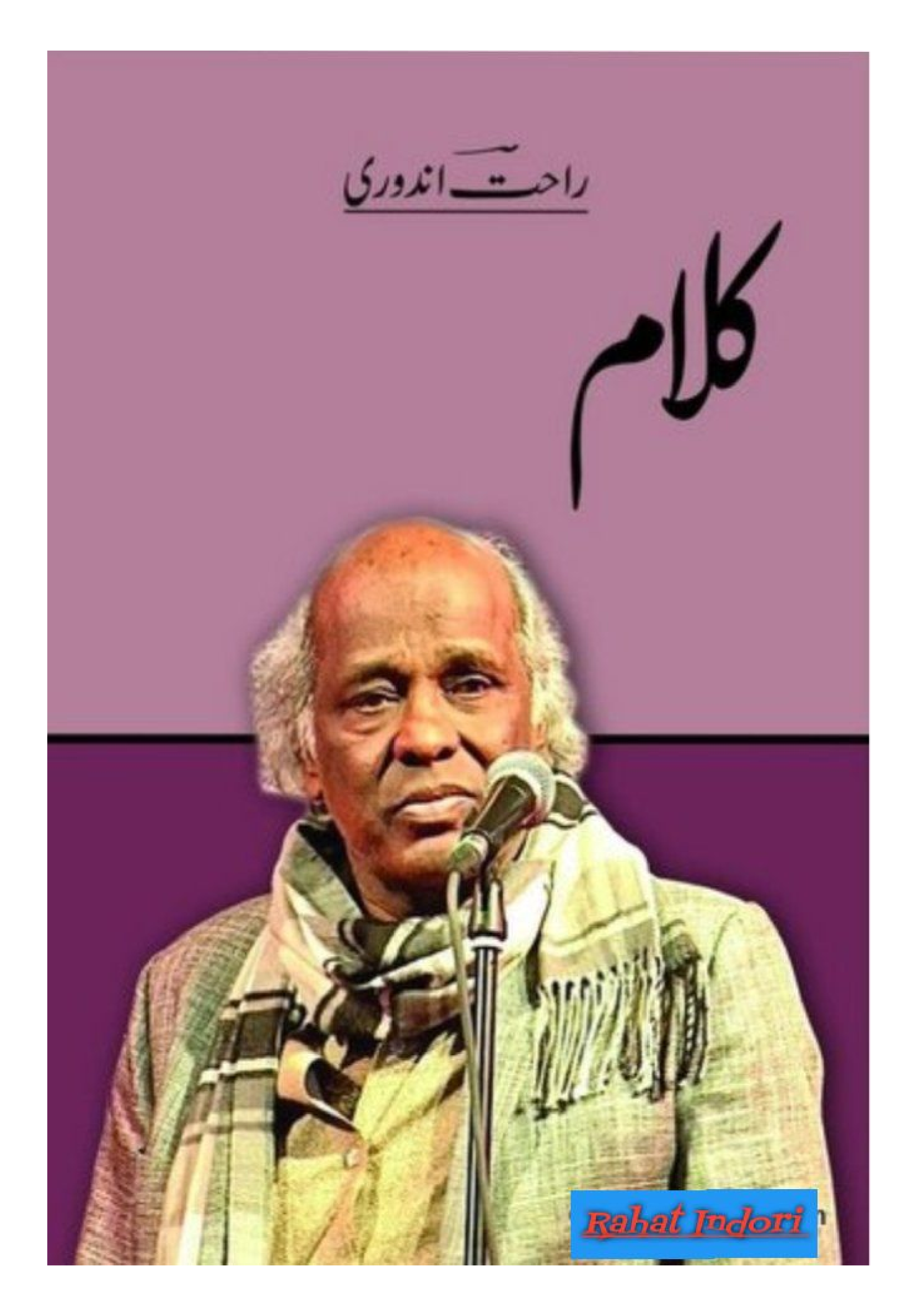


راحت اندوری
کلام
Rahat Indori

میں چاہتا تھا خود سے ملاقات ہو مگر!
آئینے میرے قد کے برابر نہیں ملے

راحتؔ اندوری



Pdf By, Misken Mazhar Ali Khan

Cel No, 00966590510687

گروپ ہٰ خاکہ ء حلم

Rs 800

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعرؔ
0336-2085325

کتاب : کلام
(انتخاب غزل)

شاعر : راحت اندوری

اشاعت اوّل: جنوری، 2015ء

اشاعت دوم: اپریل، 2019ء

ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
0345-2610434
021-32761100
rangeadab@yahoo.com
www.facebook.com/rangeadab

تزئین کار : شیرازی شاعر
0300-2054154

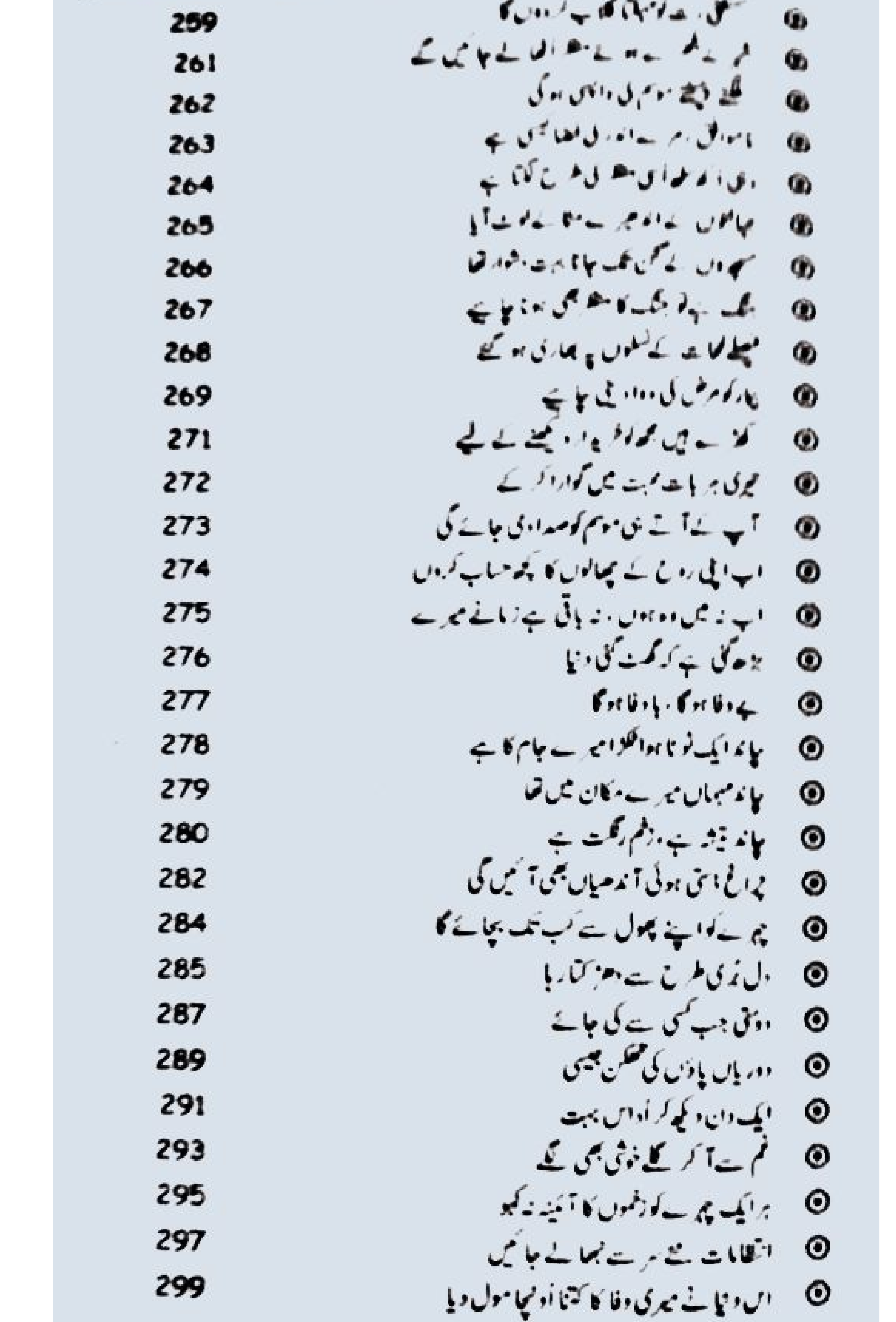


فہرست

کلام (انتخاب غزل) شاعر: راحت اندوری







●●●

○

ہر مسافر ہے سہارے تیرے
کشتیاں تیری ، کنارے تیرے

تیرے دامن کو خبر دے کوئی
ٹوٹتے ہیں تارے تیرے

دھوپ دریا میں روانی تھی بہت
بہہ گئے چاند ستارے تیرے

تیرے دروازے کو جنبش نہ ہوئی
میں نے سب نام پکارے تیرے

بے طلب آنکھوں میں کیا کیا کچھ ہے
وہ سمجھتا ہے اشارے تیرے

کب پسیجیں گے یہ بہرے بادل
ہیں شجر ہاتھ پسارے تیرے

میرا ایک پل بھی مجھے مل نہ سکا
میں نے دن رات گزارے تیرے

تیری آنکھیں تیری بینائی ہے
تیرے منظر ہیں ، نظارے تیرے

یہ میری پیاس بتا سکتی ہے
کیوں سمندر ہوئے کھارے تیرے

جو بھی منسوب ترے نام سے تھے
میں نے سب قرض اُتارے تیرے

تو نے لکھا میرے چہرے پہ دُھواں
میں نے آئینے سنوارے تیرے

اور مرا دل وہی مفلس کا چراغ
چاند تیرا ہے ، ستارے تیرے

ہم نے خود اپنی رہ نمائی کی
اور شہرت ہوئی خدائی کی

میں نے دنیا سے، مجھ سے دنیا نے
سینکڑوں بار بے وفائی کی

کھلے رہتے ہیں سارے دروازے
کوئی صورت نہیں رہائی کی

لوٹ کر ہم ملے ہیں پہلی بار
یہ شروعات ہے جدائی کی

سوئے رہتے ہیں اوڑھ کر خود کو
اب ضرورت نہیں رضائی کی

منزلیں چومتی ہیں میرے قدم
داد دیجے شکستہ پائی کی

زندگی جیسے تیسے کاٹنی ہے
کیا بھلائی کی ، کیا برائی کی

عشق کے کاروبار میں ہم نے
جان دے کر بڑی کمائی کی

اب کسی کی زباں نہیں کھلتی
رسم جاری ہے منہ بھرائی کی

○

میرے مرنے کی خبر ہے اُس کو
جانے کس بات کا ڈر ہے اُس کو

بند رکھتا ہے وہ آنکھیں اپنی
شام کی طرح سحر ہے اُس کو

میں کسی سے بھی ملوں، کچھ بھی کروں
میری نیت کی خبر ہے اُس کو

بھول جانا بھی اُسے سہل نہیں
یاد رکھنا بھی ہنر ہے اُس کو

منزلیں ساتھ لیے پھرتا ہے
کتنا دشوار سفر ہے اُس کو

کیوں بھڑک اُٹھتا ہے جلتے جلتے
کچھ ہواؤں کا اثر ہے اُس کو

اب وہ پہلا سا نظر آتا نہیں
ایسا لگتا ہے نظر ہے اُس کو

○

نام لکھا ہے آج کس کس کا
''ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا''

شاخ پر عمر کٹ گئی گل کی
باغ ہے جانے کون بے حس کا

خوار پھرتے ہیں آئینہ ہو کر
جانے منہ دیکھنا ہے کس کس کا

سر پہ رکھ کر زمین پھرتا ہوں
ساتھ اُس کے ہوں میں نہیں، جس کا

پڑھ چکا جو لکھا نہیں اب تک
ہے کرشمہ مرے مدرس کا

بجھ گئے چاند سب حویلی کے
جل رہا ہے چراغ مفلس کا

میرؔ، جیسا تھا دو صدی پہلے
حال اب بھی وہی ہے مجلس کا

○

ہاتھ خالی ہیں ترے شہر سے جاتے جاتے
جان ہوتی تو مری جان لٹاتے جاتے

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جاتے

اب کے مایوس ہوا یاروں کو رخصت کر کے
جا رہے تھے تو کوئی زخم لگاتے جاتے

رینگنے کی بھی اجازت نہیں ہم کو ورنہ
ہم جدھر جاتے نئے پھول کھلاتے جاتے

میں تو جلتے ہوئے صحراؤں کا اک پتھر تھا
تم تو دریا تھے مری پیاس بجھاتے جاتے

مجھ کو رونے کا سلیقہ بھی نہیں ہے شاید
لوگ ہنستے ہیں مجھے دیکھ کے آتے جاتے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

O

یہاں کب تھی جہاں لے آئی دنیا
یہ دنیا کو کہاں لے آئی دنیا

زمیں کو آسمانوں سے ملا کر
زمیں پر آسماں لے آئی دنیا

میں خود سے بات کرنا چاہتا تھا
خدا کو درمیاں لے آئی دنیا

چراغوں کی لویں سہمی ہوئی ہیں
سنا ہے آندھیاں لے آئی دنیا

جہاں میں تھا وہاں دنیا کہاں تھی
وہاں میں ہوں جہاں لے آئی دنیا

توقع ہم نے کی تھی شاخِ گل کی
مگر تیر و کماں لے آئی دنیا

○

اک دنیا موسم نیا ، منظر کھلا
کوئی دروازہ مرے اندر کھلا

اک غزل کمرے کی چھت پر منتشر
اک قلم رکھا ہے کاغذ پر کھلا

لیکن اُڑنے کی سکت باقی نہیں
ہے کئی دن سے قفس کا در کھلا

اپنے اندر بند ہوں اک عمر سے
دل شکستہ ، پا برہنہ ، سر کھلا

یہ خیال اب زخم بن کر رہ گیا
کس کے ذمے چھوڑ آئے گھر کھلا

اب میسر ہی کہاں وہ تن لحاف
اب کہاں رہتا ہوں میں شب بھر کھلا

عمر بھر کی نیند پوری ہو چکی
تب کہیں جا کر مرا بستر کھلا

○

اپنے دیوار و در سے پوچھتے ہیں
گھر کے حالات گھر سے پوچھتے ہیں

کیوں اکیلے ہیں قافلے والے
ایک اک ہم سفر سے پوچھتے ہیں

کیا کبھی زندگی بھی دیکھیں گے
بس یہی عمر بھر سے پوچھتے ہیں

جرم ہے خواب دیکھنا بھی کیا
رات بھر چشمِ تر سے پوچھتے ہیں

یہ ملاقات آخری تو نہیں
ہم جدائی کے ڈر سے پوچھتے ہیں

زخم کا نام پھول کیسے پڑا
تیرے دستِ ہنر سے پوچھتے ہیں

کتنے جنگل ہیں اِن مکانوں میں
بس یہی شہر بھر سے پوچھتے ہیں

یہ جو دیوار ہے، یہ کس کی ہے
ہم اِدھر، وہ اُدھر سے پوچھتے ہیں

ہیں کنیزیں بھی اِسی محل میں کیا
شاہ زادوں کے ڈر سے پوچھتے ہیں

کیا کہیں قتل ہو گیا سورج
رات سے رات بھر سے پوچھتے ہیں

کون وارث ہے چھاؤں کا آخر
دھوپ میں ہم سفر سے پوچھتے ہیں

یہ کنارے بھی کتنے سادہ ہیں
کشتیوں کو بھنور سے پوچھتے ہیں

وہ گزرتا تو ہو گا اب تنہا
ایک اک رہ گزر سے پوچھتے ہیں

○

موسم بلائیں گے تو صدا کیسے آئے گی
سب کھڑکیاں ہیں بند ہوا کیسے آئے گی

میرا خلوص اِدھر ہے، اُدھر ہے ترا غرور
تیرے بدن پہ میری قبا کیسے آئے گی

رستے میں سر اُٹھائے ہیں رسموں کی ناگنیں
اے جانِ انتظار بتا، کیسے آئے گی

سر رکھ کے میرے زانو پہ سوئی ہے زندگی
ایسے میں آئی بھی تو قضا کیسے آئے گی

آنکھوں میں اشک یوں ہی اگر قید ہو گئے
تاروں کو ٹوٹنے کی ادا کیسے آئے گی

وہ بے وفا یہاں سے بھی گزرا ہے بارہا
اِس شہر کی حدوں میں وفا کیسے آئے گی

○

جتنا دیکھ آئے ہیں ، اچھا ہے ، یہی کافی ہے
اب کہاں جائیے ، دنیا ہے ، یہی کافی ہے

ہم سے ناراض ہے سورج کہ پڑے سوتے ہیں
جاگ اُٹھنے کا ارادہ ہے ، یہی کافی ہے

اب ضروری تو نہیں ہے کہ وہ پھل دار بھی ہو
پیڑ سے شاخ کا رشتہ ہے ، یہی کافی ہے

لاؤں میں تم کو سمندر کے علاقے لکھ دوں
میرے حصے میں یہ قطرہ ہے، یہی کافی ہے

کیا ضروری ہے کبھی تجھ سے ملاقات بھی ہو
تجھ سے ملنے کی تمنا ہے، یہی کافی ہے

گالیوں سے بھی نوازے تو کرم ہے اُس کا
وہ مجھے یاد تو کرتا ہے، یہی کافی ہے

اب کسی اور تماشے کی ضرورت کیا تھی
یہ جو دنیا کا تماشا ہے، یہی کافی ہے

○

چراغوں کا گھرانہ چل رہا ہے
ہوا سے دوستانہ چل رہا ہے

جوانی کی ہوائیں چل رہی ہیں
بزرگوں کا خزانہ چل رہا ہے

مری گم گشتگی پہ ہنسنے والو!
مرے پیچھے زمانہ چل رہا ہے

ابھی ہم زندگی سے مل نہ پائے
تعارف غائبانہ چل رہا ہے

نئے کردار آتے جا رہے ہیں
مگر ناٹک پرانا چل رہا ہے

وہی دنیا، وہی سانسیں، وہی ہم
وہی سب کچھ پرانا چل رہا ہے

زیادہ کیا توقع ہو غزل سے
میاں، بس آب و دانہ چل رہا ہے

سمندر سے کسی دن پھر ملیں گے
ابھی پینا پلانا چل رہا ہے

وہی محشر، وہی ملنے کا وعدہ
وہی بوڑھا بہانا چل رہا ہے

یہاں اک مدرسہ ہوتا تھا پہلے
مگر اب کارخانہ چل رہا ہے

○

محبتوں کے سفر پر نکل کے دیکھوں گا
یہ پُل صراط اگر ہے تو چل کے دیکھوں گا

سوال یہ ہے کہ رفتار کس کی کتنی ہے
میں آفتاب سے آگے نکل کے دیکھوں گا

مذاق اچھا رہے گا یہ چاند تاروں سے
میں آج شام سے پہلے ہی ڈھل کے دیکھوں گا

وہ میرے حکم کو فریاد جان لیتا ہے
اگر یہ سچ ہے تو لہجہ بدل کے دیکھوں گا

اُجالے بانٹنے والوں پہ کیا گزرتی ہے
کسی چراغ کی مانند جل کے دیکھوں گا

عجب نہیں کہ وہی روشنی مجھے مل جائے
میں اپنے گھر سے کسی دن نکل کے دیکھوں گا

○

رات بہت تاریک نہیں ہے
لیکن گھر نزدیک نہیں ہے

آنسو باغی ہو سکتے ہیں
ہنستے رہنا ٹھیک نہیں ہے

تنقیدیں باریک ہیں جتنی
فن اتنا باریک نہیں ہے

آج ہے دل کچھ ہلکا ہلکا
آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے

عشق ازل ہے، عشق ابد ہے
عشق کوئی تحریک نہیں ہے

کوئی تازہ شعر ہو نازل
حق مانگا ہے، بھیک نہیں ہے

دن ہیں جتنے دھندلے دھندلے
شب اتنی تاریک نہیں ہے

○

وہ کبھی شہر سے گزرے تو ذرا پوچھیں گے
زخم ہو جاتے ہیں کس طرح دوا ، پوچھیں گے

گم نہ ہو جائیں مکانوں کے گھنے جنگل میں
کوئی مل جائے تو ہم گھر کا پتا پوچھیں گے

یہ رہا نامۂ اعمال مگر تجھ سے بھی
کچھ سوالات تو ہم بھی ، اے خدا پوچھیں گے

کہیں مل جائے اکیلے میں تو یہ سوچتے ہیں
زندگی تجھ سے بھی جینے کا مزا پوچھیں گے

میرے سچ سے اُنہیں کیا لینا ہے میں جانتا ہوں
ہاتھ قرآن پہ رکھوا کے وہ کیا پوچھیں گے

وہ کہیں کرنیں سمیٹے ہوئے مل جائے گا
کب رفو ہو گی اُجالوں کی قبا ، پوچھیں گے

وہ جو منصف ہے تو کیا کچھ بھی سزا دے دے گا
ہم بھی رکھتے ہیں زباں پہلے خطا پوچھیں گے

○

تیرے وعدے کی ، تیرے پیار کی محتاج نہیں
یہ کہانی کسی کردار کی محتاج نہیں

آسماں اوڑھ کے سوئے ہیں کھلے میداں میں
اپنی یہ چھت کسی دیوار کی محتاج نہیں

خالی کشکول پہ اِترائی ہوئی پھرتی ہے
یہ فقیری کسی دستار کی محتاج نہیں

خود کفیلی کا ہنر سیکھ لیا ہے میں نے
زندگی اب کسی سرکار کی محتاج نہیں

میری تحریر ہے چسپاں مری پیشانی پر
اب زباں لذلتِ اظہار کی محتاج نہیں

لوگ ہونٹوں پہ سجائے ہوئے پھرتے ہیں مجھے
میری شہرت کسی اخبار کی محتاج نہیں

روز آباد نئے شہر کیا کرتی ہے
شاعری اب کسی دربار کی محتاج نہیں

اِسے طوفاں ہی کنارے سے لگا دیتے ہیں
میری کشتی کسی پتوار کی محتاج نہیں

میں نے ملکوں کی طرح لوگوں کے دل جیتے ہیں
یہ حکومت کسی تلوار کی محتاج نہیں

اُونچے داموں پہ بکا کرتے ہیں بازار میں خواب
یہ وہ شے ہے جو خریدار کی محتاج نہیں

○

سب کو رُسوا باری باری کیا کرو
ہر موسم میں فتوے جاری کیا کرو

راتوں کا نیندوں سے رشتہ ٹوٹ چکا
اپنے گھر کی پہرے داری کیا کرو

قطرہ قطرہ شبنم گن کر کیا ہو گا
دریاؤں کی دعوے داری کیا کرو

روز قصیدے لکھو گونگے ، بہروں کے
فرصت ہو تو یہ بے گاری کیا کرو

شب بھر آنے والے دن کے خواب بنو
دن بھر فکرِ شب بیداری کیا کرو

چاند زیادہ روشن ہے تو رہنے دو
جگنو بھیا! جی مت بھاری کیا کرو

جب جی چاہے موت بچھا دو بستی میں
لیکن باتیں پیاری پیاری کیا کرو

رات دن دریا میں روز اُترتی ہے
اِس کشتی میں خوب سواری کیا کرو

روز وہی اک کوشش زندہ رہنے کی
مرنے کی بھی کچھ تیاری کیا کرو

خواب لپیٹے سوتے رہنا ٹھیک نہیں
فرصت ہو تو شب بیداری کیا کرو

کاغذ کو سب سونپ دیا یہ ٹھیک نہیں
شعر کبھی خود پر بھی طاری کیا کرو

○

شام سے پہلے شام کر دی ہے
کیا کہانی تمام کر دی ہے

چند لوگوں کو تھی خبر میری
خاص لوگوں نے عام کر دی ہے

آج سورج نے میرے آنگن میں
ہر کرن بے نیام کر دی ہے

جس سے رہتا ہے آسماں ناراض
وہ زمیں میرے نام کر دی ہے

دوپہر تک تو ساتھ چل سورج
تو نے رستے میں شام کر دی ہے

چہرہ چہرہ حیات تھی لیکن
آئینوں کی غلام کر دی ہے

کیا پڑھیں ہم کہ کچھ کتابوں نے
روشنی تک حرام کر دی ہے

O

مسئلہ پیاس کا یوں حل ہو جائے
جتنا اَمرت ہے ہلاہل ہو جائے

شہرِ دل میں ہے عجب سناٹا
تیری یاد آئے تو ہل چل ہو جائے

زندگی ، ایک ادھوری تحریر
موت آئے تو مکمل ہو جائے

اور اک مور کہیں جنگل میں
ناچتے ناچتے پاگل ہو جائے

حشر کی راہ کہاں تک دیکھوں
جو بھی ہونا ہے اِسی پل ہو جائے

تھوڑی رونق ہے ہمارے دم سے
ورنہ یہ شہر تو جنگل ہو جائے

پھر خدا چاہے تو آنکھیں لے لے
بس میرا خواب مکمل ہو جائے

○

اِدھر کی شے اُدھر کر دی گئی ہے
زمیں زیر و زبر کر دی گئی ہے

یہ کالی رات ہے دو چار پل کی
یہ کہنے میں سحر کر دی گئی ہے

تعارف کو ذرا پھیلا دیا ہے
کہانی مختصر کر دی گئی ہے

نہ پوچھو کیسے گزری عمر ساری
ذرا میں عمر بھر کر دی گئی ہے

عبادت میں بسر کرنی تھی لیکن
خرابوں میں بسر کر دی گئی ہے

کئی ذرّات باغی ہو چکے ہیں
ستاروں کو خبر کر دی گئی ہے

وہ میری ہم قدم ہونے نہ پائی
جو میری ہم سفر کر دی گئی ہے

ہمارے جگنوؤں سے دشمنی تھی
ذرا پہلے سحر کر دی گئی ہے

○

نظارہ دیکھیے کلیوں کے پھول ہونے کا
یہی ہے وقت دعائیں قبول ہونے کا

یہ طے کریں کہ ابھی آدمی بھی ہیں کہ نہیں
جو لوگ کرتے ہیں دعویٰ رسول ہونے کا

چلو فلک پہ کہیں گھر تلاش کرتے ہیں
زمیں پہ کچھ نہیں حاصل حصول ہونے کا

تھے گہری نیند میں ہم اور گزر گیا موسم
ہمارے خوابوں کی قیمت وصول ہونے کا

ہے آسماں سے بلند اُس کا مرتبہ جس کو
شرف ہے آپ کے قدموں کی دھول ہونے کا

وہ آئے بھی تو پریشاں، نہ آئے بھی تو اُداس
میں ڈھونڈتا ہوں بہانہ ملول ہونے کا

وہ ساری عمر اصولوں پہ جان دیتا رہا
مجھے بھی نشہ رہا بے اصول ہونے کا

○

نیندیں کیا کیا خواب دکھا کر غائب ہیں
آنکھیں تو موجود ہیں منظر غائب ہیں

دروازے پر دستک دیں تو کیوں کر دیں
گھر والے موجود ہیں اور گھر غائب ہیں

جانے یہ تصویر میں کس کا لشکر ہے
ہاتھوں میں شمشیریں ہیں ، سر غائب ہیں

[illegible]
نقشے میں دو چار سمندر غائب ہیں

شہر نئے آباد ہوئے میدانوں میں
پورس ہیں معدوم ، سکندر غائب ہیں

دھوکے باز مجاور حاکم بن بیٹھے
درگاہوں سے مست قلندر غائب ہیں

غالب بھی ہے، بچپن بھی ہے شہروں میں
مجنوں بھی ہے ، لیکن پتھر غائب ہیں

○

پرانے شہروں کے منظر نکلنے لگتے ہیں
زمیں جہاں بھی کھلے گھر نکلنے لگتے ہیں

میں کھولتا ہوں صدف موتیوں کے چکر میں
مگر یہاں بھی سمندر نکلنے لگتے ہیں

تو ناخنوں کے ہنر سے نکالیے سونا
اگر کدال سے پتھر نکلنے لگتے ہیں

حسین لگتے ہیں جاڑوں میں صبح کے منظر
ستارے دھوپ پہن کر نکلنے لگتے ہیں

بلندیوں کا تصور بھی خوب ہوتا ہے
کبھی کبھی تو مرے پر نکلنے لگتے ہیں

برے دنوں سے بچانا مجھے مرے مولی
قریبی دوست بھی بچ کر نکلنے لگتے ہیں

اگر خیال بھی آئے کہ تجھ کو خط لکھوں
تو گھونسلوں سے کبوتر نکلنے لگتے ہیں

○

جتنے اپنے تھے سب پرائے تھے
ہم ہوا کو گلے لگائے تھے

جتنی قسمیں تھیں سب تھیں شرمندہ
جتنے وعدے تھے سر جھکائے تھے

جتنے آنسو تھے سب تھے بیگانے
جتنے مہماں تھے بن بلائے تھے

سب کتابیں پڑھی پڑھائی تھیں
سارے قصے سنے سنائے تھے

ایک بنجر زمین کے سینے پر
میں نے کچھ آسماں اُگائے تھے

ورنہ اوقات کیا تھی سایوں کی
دھوپ نے حوصلے بڑھائے تھے

صرف دو گھونٹ پیاس کی خاطر
عمر بھر دھوپ میں نہائے تھے

حاشیے پر کھڑے ہوئے ہیں ہم
ہم نے خود حاشیے بنائے تھے

میں اکیلا اُداس بیٹھا تھا
شام نے قہقہے لگائے تھے

ہے غلط اُس کو بے وفا کہنا
ہم کہاں کے دُھلے دھلائے تھے

آج کانٹوں بھرا مقدر ہے
ہم نے گل بھی بہت کھلائے تھے

صرف سچ اور جھوٹ کی میزان میں رکھے رہے
ہم بہادر تھے مگر میدان میں رکھے رہے

جگنوؤں نے پھر اندھیروں سے لڑائی جیت لی
چاند سورج گھر کے روشن دان میں رکھے رہے

دھیرے دھیرے ساری کرنیں خودکشی کرنے لگیں
ہم صحیفہ تھے مگر جزدان میں رکھے رہے

بند کمرے کھول کر سچائیاں رہنے لگیں
خواب کچی دھوپ تھے دالان میں رکھے رہے

صرف اتنا فاصلہ ہے زندگی سے موت کا
شاخ سے توڑے گئے، گلدان میں رکھے رہے

زندگی بھر اپنی گونگی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ
ہم بھی گھر کے قیمتی سامان میں رکھے رہے

دھوپ بہت ہے موسم جل تھل بھیجو نا
بابا میرے نام کا بادل بھیجو نا

مولسری کی شاخوں پر بھی دیئے جلیں
شاخوں کا کیسریا آنچل بھیجو نا

ننھی منی سب چہکاریں کہاں گئیں
موروں کے پیروں کی پایل بھیجو نا

بستی بستی دہشت کس نے بو دی ہے
گلیوں ، بازاروں کی ہل چل بھیجو نا

سارے موسم ایک اسی کے عادی ہیں
چھاؤں کی خوشبو ، دھوپ کی صندل بھیجو نا

میں بستی میں آخر کس سے بات کروں
میرے جیسا کوئی پاگل بھیجو نا

سر پر سات آکاش ۔ زمیں پر سات سمندر بکھرے ہیں
آنکھیں چھوٹی پڑ جاتی ہیں اتنے منظر بکھرے ہیں

زندہ رہنا کھیل نہیں ہے ، اس آباد خرابے میں
وہ بھی اکثر ٹوٹ گیا ہے ، ہم بھی اکثر بکھرے ہیں

اس بستی کے لوگوں سے جب باتیں کیں تو یہ جانا
دنیا بھر کو جوڑنے والے اندر اندر بکھرے ہیں

ان راتوں سے اپنا رشتہ جانے کیسا رشتہ ہے
نیندیں کمروں میں جاگی ہیں خواب چھتوں پر بکھرے ہیں

آنگن کے معصوم شجر نے ایک کہانی لکھی ہے
اتنے پھل شاخوں پہ نہیں تھے جتنے پتھر بکھرے ہیں

ساری دھرتی ، سارے موسم ، ایک ہی جیسے لگتے ہیں
آنکھوں آنکھوں قید ہوئے تھے منظر منظر بکھرے ہیں

○

سوال گھر نہیں بنیاد پر اُٹھایا ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اُٹھایا ہے

ہمیشہ سر پہ رہی اک چٹان رشتوں کی
یہ بوجھ وہ ہے جسے عمر بھر اُٹھایا ہے

مری غلیل کے پتھر کا کارنامہ تھا
مگر یہ کون ہے جس نے ثمر اُٹھایا ہے

یہی زمیں میں دبائے گا ایک دن ہم کو
یہ آسماں جسے دوش پر اُٹھایا ہے

بلندیوں کو پتا چل گیا کہ پھر میں نے
ہوا کا ٹوٹا ہوا ایک پر اُٹھایا ہے

مہابلی سے بغاوت بہت ضروری تھی
قدم یہ ہم نے سمجھ سوچ کر اُٹھایا ہے

○

پہلی شرط جدائی ہے
عشق بڑا ہرجائی ہے

گم ہیں ہوش ہواؤں کے
کس کی خوشبو آئی ہے

خواب قریبی رشتے دار
لیکن نیند پرائی ہے

چاند تراشے ساری عمر
تب کچھ دھوپ کمائی ہے

میں بچھڑا ہوں ڈالی سے
دنیا کیوں مرجھائی ہے

دل پر کس نے دستک دی
تم ہو یا تنہائی ہے

دریا دریا ناپ چکے
مٹھی بھر گہرائی ہے

سورج ٹوٹ کے بکھرا تھا
رات نے ٹھوکر کھائی ہے

کوئی مسیحا کیا جانے
زخم ہے یا گہرائی ہے

واہ رے پاگل، واہ رے دل
اچھی قسمت پائی ہے

۶

انگلیاں یوں نہ سب پر اُٹھایا کرو
خرچ کرنے سے پہلے کمایا کرو

زندگی کیا ہے خود ہی سمجھ جاؤ گے
بارشوں میں پتنگیں اُڑایا کرو

دوستوں سے ملاقات کے نام پر
نیم کی پتیوں کو چبایا کرو

رات کے بعد جب تم سحر دیکھ لو
کچھ فقیروں کو کھانا کھلایا کرو

گھر کسی کا سہی تم بھی حق دار ہو
روز آیا کرو ، روز جایا کرو

اپنے سینے پہ دو گز زمیں باندھ کر
آسمانوں کا ظرف آزمایا کرو

چاند سورج کہاں ، اپنی منزل کہاں
ایسے ویسوں کو منہ مت لگایا کرو

مجھے ڈبو کے بہت شرمسار رہتی ہے
وہ ایک موج جو دریا کے پار رہتی ہے

ہمارے طاق بھی بے زار ہیں اُجالوں سے
دیے کی لَو بھی ہوا پر سوار رہتی ہے

پھر اُس کے بعد وہی باسی منظروں کے جلوس
بہار چند ہی لمحے بہار رہتی ہے

اسی سے قرض چکائے ہیں میں نے صدیوں کے
یہ زندگی جو ہمیشہ اُدھار رہتی ہے

ہماری شہر کے دانش وروں سے یاری ہے
اِسی لیے تو قبا تار تار رہتی ہے

مجھے خریدنے والو! قطار میں آؤ

○

درمیاں اک زمانہ رکھا جائے
تب کوئی پل سہانا رکھا جائے

سر پہ سورج سوار رہتا ہے
پیٹھ پر شامیانہ رکھا جائے

تو یہ اب طے ہوا کہ اپنے ساتھ
کوئی اپنے سوا نہ رکھا جائے

خوب باتیں رہیں گی رستے بھر
دھوپ سے دوستانہ رکھا جائے

ہوں نگاہوں زمین پہ لیکن
آسماں پر نشانہ رکھا جائے

زخم پر زخم کا گماں نہ رہے
زخم اتنا پرانا رکھا جائے

دل لٹانے میں احتیاط رہے
یہ خزانہ کھلا نہ رکھا جائے

نیل پڑتے رہیں جبینوں پر
پتھروں کو خفا نہ رکھا جائے

یار! اب اُس کی بے وفائی کا
نام کچھ شاعرانہ رکھا جائے

○

ہمیں دن رات مرنا چاہیے تھا
میاں کچھ کر گزرنا چاہیے تھا

بہت ہی خوب صورت ہے یہ دنیا
یہاں کچھ دن ٹھہرنا چاہیے تھا

مجھے تو نے کنارے سے ہے جانا
ذرا گہرے اُترنا چاہیے تھا

یہاں صدیوں سے تاریکی جمی ہے
مری شب کو سحرنا چاہیے تھا

اکیلی رات بستر پہ پڑی ہے
مجھے اس دن سے اترنا چاہیے تھا

ڈبو کر مجھ کو خوش ہوتا ہے دریا
اسے تو ڈوب مرنا چاہیے تھا

کسی سے بے وفائی کی ہے میں نے
مجھے اقرار کرنا چاہیے تھا

یہ دیکھو کرچیاں ہیں آئینوں کی
سلیقے سے سنورنا چاہیے تھا

کسی دن اُس کی محفل میں پہنچ کر
گلوں میں رنگ بھرنا چاہیے تھا

فلک پہ تبصرہ کرنے سے پہلے
زمیں کا قرض اُترنا چاہیے تھا

حوصلے زندگی کے دیکھتے ہیں
چلیے کچھ روز جی کے دیکھتے ہیں

نیند پچھلی صدی سے زخمی ہے
خواب اگلی صدی کے دیکھتے ہیں

روز ہم اک اندھیری دھند کے پار
قافلے روشنی کے دیکھتے ہیں

دھوپ اتنی کراہتی کیوں ہے
چھاؤں کے زخم سی کے دیکھتے ہیں

ٹکٹکی باندھ لی ہے آنکھوں نے
راستے واپسی کے دیکھتے ہیں

بارشوں سے تو پیاس بجھتی نہیں
آیئے زہر پی کے دیکھتے ہیں

داؤ پر میں بھی ، داؤ پر تو بھی
بے خبر میں بھی ، بے خبر تو بھی

آسماں مجھ سے دوستی کر لے
در بہ در میں بھی ، در بہ در تو بھی

کچھ دنوں شہر کی ہوا کھا لے
سیکھ جائے گا سب ہنر تو بھی

میں ترے ساتھ ، تو کسی کے ساتھ
ہم سفر میں بھی ، ہم سفر تو بھی

ہیں وفاؤں کے دونوں دعوے دار
میں بھی اِس پل صراط پر ، تو بھی

اے مرے دوست تیرے بارے میں
کچھ الگ رائے تھی مگر ، تو بھی

○

بیٹھے بیٹھے کوئی خیال آیا
زندہ رہنے کا پھر سوال آیا

کون دریاؤں کا حساب رکھے
نیکیاں ، نیکیوں میں ڈال آیا

زندگی کس طرح گزارتے ہیں
زندگی بھر نہ یہ کمال آیا

جھوٹ بولا ہے کوئی آئینہ
ورنہ پتھر میں کیسے بال آیا

وہ جو دو گز زمیں تھی میرے نام
آسماں کی طرف اُچھال آیا

کیوں یہ سیلاب سا ہے آنکھوں میں
مسکرائے تھے ہم ، خیال آیا

○

موسم کی من مانی ہے
آنکھوں آنکھوں پانی ہے

سایہ سایہ لکھ ڈالو!
دنیا دھوپ کہانی ہے

سب پہ ہنستے رہتے ہیں
پھولوں کی نادانی ہے

ہائے یہ دنیا! ہائے یہ لوگ
ہائے! یہ سب کچھ فانی ہے

ساتھ اک دریا رکھ لینا
رستہ ریگستانی ہے

کتنے سپنے دیکھ لیے
آنکھوں میں حیرانی ہے

دل والے اب کم کم ہیں
ویسے قوم پرانی ہے

بارش ، دریا ، ساگر ، اوس
آنسو پہلا پانی ہے

تجھ کو بھولے بیٹھے ہیں
کیا یہ کم قربانی ہے

دریا ہم سے آنکھ ملا
دیکھیں کتنا پانی ہے

○

سر پر بوجھ اندھیاروں کا ہے مولیٰ خیر
اور سفر کہساروں کا ہے مولیٰ خیر

دشمن سے تو ٹکر لی ہے سو سو بار
سامنا اب کے یاروں کا ہے مولیٰ خیر

اِس دنیا میں تیرے بعد میرے سر پر
سایہ رشتے داروں کا ہے مولیٰ خیر

دنیا سے باہر بھی نکل کر دیکھ چکے
سب کچھ دنیا داروں کا ہے مولیٰ خیر

اور قیامت میرے چراغوں پر ٹوٹی
جھگڑا چاند ستاروں کا ہے مولیٰ خیر

لکھ رہا ہے حجرہ پیر فقیروں کا
اور منظر درباروں کا ہے مولیٰ خیر

چوراہوں پر وردی والے آ پہنچے
موسم پھر تہواروں کا ہے مولیٰ خیر

ایک خدا ہے ، ایک پیمبر ، ایک کتاب
جھگڑا تو دستاروں کا ہے مولیٰ خیر

وقت ملا تو مسجد بھی ہو آئیں گے
باقی کام مزاروں کا ہے مولیٰ خیر

میں نے الف سے یے تک خوشبو بکھرا دی
لیکن گاؤں گنواروں کا ہے مولیٰ خیر

○

ہمیں اب عشق کا چالا پڑا ہے
بڑے منہ زور سے پالا پڑا ہے

کئی دن سے نہیں ڈوبا یہ سورج
ہتھیلی پر مری چھالا پڑا ہے

یہ سازش دھوپ کی ہے یا ہوا کی
گلوں کا رنگ کیوں کالا پڑا ہے

سفر پر تو میں تنہا جا رہا ہوں
یہ بستی بھر میں کیوں تالا پڑا ہے

مری پلکوں پہ اُترے پھر فرشتے
سمندر پھر تہ و بالا پڑا ہے

سنہری چاند اُترا پھر ندی میں
کنارے چاند کا ہالا پڑا ہے

یہاں ہوتی ہیں ختم اُونچی اُڑانیں
زمیں پر آسماں والا پڑا ہے

اُلجھ کر رہ گئے ہیں سارے منظر
ہماری آنکھ میں جالا پڑا ہے

ہوا ہے دوپہر تک بھیگی بھیگی
سویرے دیر تک پالا پڑا ہے

زندگی کی ہر کہانی بے اثر ہو جائے گی
ہم نہ ہوں گے تو یہ دنیا در بہ در ہو جائے گی

پاؤں پتھر کر کے چھوڑے گی اگر رُک جایئے
چلتے رہیے تو زمیں بھی ہم سفر ہو جائے گی

جگنوؤں کو ساتھ لے کر رات روشن کیجیے
راستہ سورج کا دیکھا تو سحر ہو جائے گی

زندگی بھی کاش میرے ساتھ رہتی عمر بھر
خیر اب جیسے بھی ہونی ہے بسر ہو جائے گی

تم نے خود ہی سر چڑھائی تھی سو اب چکھو مزہ
میں نہ کہتا تھا، کہ دنیا دردِ سر ہو جائے گی

تلخیاں بھی لازمی ہیں زندگی کے واسطے
اتنا میٹھا بن کے مت رہیے شکر ہو جائے گی

O

شجر ہیں اب ثمر آثار میرے
اُگے آتے ہیں دعوے دار میرے

مہاجر ہیں نہ اب انصار میرے
مخالف ہیں بہت اِس بار میرے

یہاں اک بوند کا محتاج ہوں میں
سمندر ، ہیں سمندر پار میرے

ابھی مُردوں میں روحیں پھونک ڈالیں
اگر چاہیں تو یہ بیمار میرے

ہوائیں اوڑھ کر سویا تھا دشمن
گئے بے کار سارے وار میرے

میں آ کر دشمنوں میں بس گیا ہوں
یہاں ہم درد ہیں دو چار میرے

ہنسی میں ٹال دینا تھا مجھے بھی
خفا کیوں ہو گئے سرکار میرے

تصور میں نہ جانے کون آیا
مہک اُٹھے در و دیوار میرے

تمہارا نام دنیا جانتی ہے
بہت رُسوا ہیں اب اشعار میرے

بھنور میں رُک گئی ہے ناؤ میری
کنارے رہ گئے اُس پار میرے

میں خود اپنی حفاظت کر رہا ہوں
ابھی سوئے ہیں پہرے دار میرے

○

یہ آئینہ فسانہ ہو چکا ہے
تجھے دیکھے زمانہ ہو چکا ہے

دوائیں کیا، دعا کیا، بد دعا کیا
سبھی کچھ تاجرانہ ہو چکا ہے

اب آنسو بھی پرانے ہو چکے ہیں
سمندر بھی پرانا ہو چکا ہے

چلو دیوانِ خاص اب کام آیا
پرندوں کا ٹھکانہ ہو چکا ہے

وہی ویرانیاں ہیں شہرِ دل میں
یہاں پہلے بھی آنا ہو چکا ہے

تری مصروفیت ہم جانتے ہیں
مگر موسم سہانا ہو چکا ہے

محبت میں ضروری ہیں وفائیں
یہ نسخہ اب پرانا ہو چکا ہے

چلو اب ہجر کا بھی ہم مزا لیں
بہت ملنا ملانا ہو چکا ہے

ہزاروں صورتیں روشن ہیں دل میں
یہ دل آئینہ خانہ ہو چکا ہے

وطن کے موسمو! اب لوٹ آؤ
تمہیں دیکھے زمانہ ہو چکا ہے

اندر کا زہر چوم لیا دُھل کے آ گئے
کتنے شریف لوگ تھے سب کھل کے آ گئے

سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بے وقوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آ گئے

مسجد میں دور دور کوئی دوسرا نہ تھا
ہم آج اپنے آپ سے مل جل کے آ گئے

نیندوں سے جنگ ہوتی رہے گی تمام عمر
آنکھوں میں بند خواب اگر کھل کے آ گئے

سورج نے اپنی شکل بھی دیکھی تھی پہلی بار
آئینے کو مزے بھی تقابل کے آ گئے

اَن جانے سائے پھرنے لگے ہیں اِدھر اُدھر
موسم ہمارے شہر میں کابل کے آ گئے

○

پاؤں سے آسمان لپٹا ہے
راستوں سے مکان لپٹا ہے

روشنی ہے ترے خیالوں کی
مجھ سے ریشم کا تھان لپٹا ہے

کر گئے سب کنارہ کشتی سے
صرف اک بادبان لپٹا ہے

دے توانائیاں مرے معبود
جسم سے خاندان لپٹا ہے

اور میں سن رہا ہوں کیا کیا کچھ
مجھ سے اک بے زبان لپٹا ہے

ساری دنیا بلا رہی ہے مگر
مجھ سے ہندوستان لپٹا ہے

○

سفر میں جب بھی ارادے جوان ملتے ہیں
کھلی ہوائیں ، کھلے بادبان ملتے ہیں

بہت کٹھن ہے مسافت نئی زمینوں کی
قدم قدم پہ نئے آسمان ملتے ہیں

میں اِس محلے میں اک عمر کاٹ آیا ہوں
جہاں پہ گھر نہیں ملتے ، مکان ملتے ہیں

جو زور زور سے کرتے ہیں بات آپس میں
سفر میں ایسے کئی بے زبان ملتے ہیں

جہاں جہاں بھی چراغوں نے خودکشی کی ہے
وہاں وہاں پہ ہوا کے نشان ملتے ہیں

رقیب ، دوست ، پڑوسی ، عزیز ، رشتے دار
مرے خلاف سبھی کے بیان ملتے ہیں

اُٹھی نگاہ تو اپنے ہی رو بہ رو ہم تھے
زمین آئینہ خانہ تھی چار سو ہم تھے

دِنوں کے بعد اچانک تمہارا دھیان آیا
خدا کا شکر کہ اِس وقت باوضو ہم تھے

وہ آئینہ تو نہیں تھا پر آئینے سا تھا
وہ ہم نہیں تھے مگر یار ہُو بہ ہُو ہم تھے

زمیں پہ لڑتے ہوئے آسماں کے نرغے میں
کبھی کبھی کوئی دشمن ، کبھو کبھو ہم تھے

ہمارا ذکر بھی اب جرم ہو گیا ہے وہاں
دِنوں کی بات ہے محفل کی آبرو ہم تھے

خیال تھا کہ یہ پتھراؤ روک دیں چل کر
جو ہوش آیا تو دیکھا لہو لہو ہم تھے

○

اُونچے اُونچے درباروں سے کیا لینا
بے چارے ہیں بے چاروں سے کیا لینا

جو مانگیں گے طوفانوں سے مانگیں گے
کاغذ کی اِن پتواروں سے کیا لینا

ہم ٹھہرے بنجارے ہم بنجاروں کو
دروازوں اور دیواروں سے کیا لینا

خوابوں والی کوئی چیز نہیں ملتی
سوچ رہا ہوں بازاروں سے کیا لینا

خالی ہاتھوں جیتنا ہے یہ جنگ ہمیں
لکڑی کی اِن تلواروں سے کیا لینا

آگ میں ہم تو باغ لگاتے ہیں، ہم کو
دوزخ تیرے انگاروں سے کیا لینا

چارہ گری کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں
بستی کے اِن بیماروں سے کیا لینا

ساتھ ہمارے کئی سنہری صدیاں ہیں
ہمیں سنیچر، اتواروں سے کیا لینا

اپنا مالک، اپنا خالق افضل ہے
آتی جاتی سرکاروں سے کیا لینا

پاؤں پسارو! ساری دھرتی اپنی ہے
یار اجازت مکاروں سے کیا لینا

○

کام سب غیر ضروری ہیں جو سب کرتے ہیں
اور ہم کچھ نہیں کرتے ہیں غضب کرتے ہیں

آپ کی نظروں میں سورج کی ہے جتنی عظمت
ہم چراغوں کا بھی اتنا ہی ادب کرتے ہیں

ہم پہ حاکم کا کوئی حکم نہیں چلتا ہے
ہم قلندر ہیں شہنشاہ لقب کرتے ہیں

دیکھیے جس کو اُسے دُھن ہے مسیحائی کی
آج کل شہر کے بیمار مطب کرتے ہیں

خود کو پتھر سا بنا رکھا ہے کچھ لوگوں نے
بول سکتے ہیں مگر بات ہی کب کرتے ہیں

ایک اک پل کو کتابوں کی طرح پڑھنے لگے
عمر بھر جو نہ کیا ہم نے وہ اب کرتے ہیں

O

کس نے دستک دی یہ دل پر کون ہے
آپ تو اندر ہیں ، باہر کون ہے

روشنی ہی روشنی ہے ہر طرف
میری آنکھوں میں منور کون ہے

آسماں جھک جھک کے کرتا ہے سوال
آپ کے قد کے برابر کون ہے

ہم رکھیں گے اپنے اشکوں کا حساب
پوچھنے والا سمندر کون ہے

ساری دنیا حیرتی ہے کس لیے
دور تک منظر بہ منظر کون ہے

مجھ سے ملنے ہی نہیں دیتا مجھے
کیا پتا یہ میرے اندر کون ہے

○

کس کا نعرہ کیسا قول ، اللہ بول
ابھی بدلتا ہے ماحول ، اللہ بول

کیسے ساتھی ، کیسے یار ، سب مکار
سب کی نیت ڈانواڈول ، اللہ بول

جیسا گاہک ویسا مال دے کر ٹال
کاغذ میں انگارے تول ، اللہ بول

انسانوں سے انسانوں تک ایک صدا
کیا تاتاری ، کیا منگول ، اللہ بول

سانسوں پر لکھ رب کا نام صبح و شام
یہی وظیفہ ہے اَن مول ، اللہ بول

سچائی کا لے کر جاپ دھرتی ناپ
دلی ہو یا آسن سول ، اللہ بول

دلالوں سے ناتا توڑ ، سب کو چھوڑ
بھیج کمینوں پر لاحول ، اللہ بول

ہر چہرے کے سامنے رکھ دے آئینہ
نوچ لے ہر چہرے کا خول ، اللہ بول

شاخِ سحر پر مہکے پھول اذانوں کے
پھینک رضائی ، آنکھیں کھول ، اللہ بول

○

شراب چھوڑ دی تم نے کمال ہے ٹھاکر
مگر یہ ہاتھ میں کیا لال لال ہے ٹھاکر

کئی ملول سے چہرے تمہارے گاؤں میں ہیں
سنا ہے تم کو بھی اِس کا ملال ہے ٹھاکر

خراب حالوں کا جو حال تھا زمانے سے
تمہارے فیض سے اب بھی بحال ہے ٹھاکر

اُدھر تمہارے خزانے جواب دیتے ہیں
اِدھر ہماری انَا کا سوال ہے ٹھاکر

کسی غریب دوپٹے کا قرض ہے اُس پر
تمہارے پاس جو ریشم کی شال ہے ٹھاکر

دعا کو ننھے گلابوں نے ہاتھ اُٹھائے ہیں
بس اب یہیں سے تمہارا زوال ہے ٹھاکر

موت کی تفصیل ہونی چاہیے
شہر میں اک جھیل ہونی چاہیے

چاند تو ہر شب نکلتا ہے مگر
طاق میں قندیل ہونی چاہیے

روشنی جو جسم تک محدود ہے
روح میں تحلیل ہونی چاہیے

حکم گونگوں کا ہے، لیکن حکم ہے
حکم کی تعمیل ہونی چاہیے

ہے کبوتر جس جگہ تصویر میں
اُس جگہ اک چیل ہونی چاہیے

اسلحے تو خیر پھر آ جائیں گے
کرفیو میں ڈھیل ہونی چاہیے

○

دیئے جلائے ، تو انجام کیا ہوا میرا
لکھا ہے تیز ہواؤں نے مرثیہ میرا

کہیں شریف نمازی ، کہیں فریبی پیر
قبیلہ میرا ، نسب میرا ، سلسلہ میرا

کسی نے زہر کہا ہے، کسی نے شہد کہا
کوئی سمجھ نہیں پایا ہے ذائقہ میرا

میں چاہتا تھا غزل آسمان ہو جائے
مگر زمین سے چپکا ہے قافیہ میرا

میں پتھروں کی طرح گونگے سامعین میں تھا
مجھے سناتے رہے لوگ واقعہ میرا

جہاں پہ کچھ بھی نہیں ہے وہاں بہت کچھ ہے
یہ کائنات تو ہے خالی حاشیہ میرا

اُسے خبر ہے کہ میں حرف حرف سورج ہوں
وہ شخص پڑھتا رہا ہے لکھا ہوا میرا

بلندیوں کے سفر میں یہ دھیان آتا ہے
زمین دیکھ رہی ہوگی راستہ میرا

میں جنگ جیت چکا ہوں مگر یہ اُلجھن ہے
اب اپنے آپ سے ہوگا مقابلہ میرا

کھنچا کھنچا میں رہا خود سے جانے کیوں ورنہ
بہت زیادہ نہ تھا مجھ سے فاصلہ میرا

○

صرف خنجر ہی نہیں آنکھوں میں پانی چاہیے
اے خدا ، دشمن بھی مجھ کو خاندانی چاہیے

شہر کی ساری الف لیلائیں بوڑھی ہو چکیں
شاہ زادے کو کوئی تازہ کہانی چاہیے

میں نے اے سورج، تجھے پوجا نہیں سمجھا تو ہے
میرے حصے میں بھی تھوڑی دھوپ آنی چاہیے

میری قیمت کون دے سکتا ہے اِس بازار میں
تم زلیخا ہو ، تمہیں قیمت لگانی چاہیے

زندگی ہے اک سفر اور زندگی کی راہ میں
زندگی بھی آئے تو ٹھوکر لگانی چاہیے

میں نے اپنی خشک آنکھوں سے لہو چھلکا دیا
اک سمندر کہہ رہا تھا مجھ کو پانی چاہیے

○

یہ دنیا جست بھر ہو گی ہماری
یہاں کیسے بسر ہو گی ہماری

یہ کالی رات ہو گی ختم کس دن
نہ جانے کب سحر ہو گی ہماری

اِسی اُمید پر یہ رتجگے ہیں
کسی دن رات بھر ہو گی ہماری

درِ مسجد پہ کوئی شے پڑی ہے
دعائے بے اثر ہو گی ہماری

چلے ہیں گمرہی کو گھر سے لے کر
یہی تو ہم سفر ہو گی ہماری

نہ جانے دن کہاں نکلے گا اپنا
نہ جانے شب کدھر ہو گی ہماری

دعا مانگیں گے کب تک آسماں سے
زمیں کب معتبر ہو گی ہماری

یہ دنیا کہکشاں کہتی ہے جس کو
کبھی یہ رہ گزر ہو گی ہماری

چبھے ہیں کس قدر تلووٴں میں کنکر
ستاروں پر نظر ہو گی ہماری

بچھڑنے میں ہی شاید اب مزا ہے
خوشی میں آنکھ تر ہو گی ہماری

دھرم بوڑھے ہو گئے ، مذہب پرانے ہو گئے
اے تماشا گر ترے کرتب پرانے ہو گئے

آج کل چھٹی کے دن بھی گھر پڑے رہتے ہیں ہم
شام ، ساحل ، تم ، سمندر ، سب پرانے ہو گئے

کیسی چاہت ، کیا محبت ، کیا مروّت ، کیا خلوص
اِن سبھی الفاظ کے مطلب پرانے ہو گئے

رینگتے رہتے ہیں ہم صدیوں سے صدیاں اوڑھ کر
ہم نئے تھے ہی کہاں جو اب پرانے ہو گئے

آستینوں میں وہی خنجر ، وہی ہم دردیاں
ہیں نئے احباب لیکن ڈھب پرانے ہو گئے

ایک ہی مرکز پہ آنکھیں زنگ آلودہ ہوئیں
چاک پر پھر پھر کے روز و شب پرانے ہو گئے

○

طوفاں تو اس شہر میں اکثر آتا ہے
دیکھیں اب کے کس کا نمبر آتا ہے

یاروں کے بھی دانت بہت زہریلے ہیں
ہم کو بھی سانپوں کا منتر آتا ہے

سوکھے بادل ہونٹوں پر کچھ لکھتے ہیں
آنکھوں میں سیلاب کا منظر آتا ہے

تقریروں میں سب کے جوہر کھلتے ہیں
اندر جو پلتا ہے باہر آتا ہے

بچ کر رہنا ، اک قاتل اس بستی میں
کاغذ کی پوشاک پہن کر آتا ہے

ہوتا ہے وہ روز تعفن ذہنوں میں
جو کپڑوں پر عطر لگا کر آتا ہے

رحمت ملنے آتی ہے پر پھیلائے
پلکوں پر جب کوئی پیمبر آتا ہے

سوکھ چکا ہوں پھر بھی میرے ساحل پر
پانی پینے روز سمندر آتا ہے

اُن آنکھوں کی نیندیں گم ہو جاتی ہیں
جن آنکھوں کو خواب میسر آتا ہے

ٹوٹ رہی ہے ہر دن مجھ میں اک مسجد
اس بستی میں روز دسمبر آتا ہے

○

مری تیزی، مری رفتار ہو جا
سُبک رو، اُٹھ کبھی تلوار ہو جا

بزرگوں کا طریق اپنانے والے
سراپا جذبۂ ایثار ہو جا

ابھی سورج صدا دے کر گیا ہے
خدا کے واسطے بیدار ہو جا

ہے فرصت تو کسی سے عشق کر لے
ہماری ہی طرح بے کار ہو جا

تری دشمن ہے تیری سادہ لوحی
مری مانے تو کچھ دشوار ہو جا

کہاں تک کھوٹے سکوں میں بکے گا
کسی دن خوبیٔ بازار ہو جا

تجھے کیا درد کی لذت بتائیں
مسیحا! آ کبھی بیمار ہو جا

شکستہ کشتیوں سے کیا امیدیں
کنارے سو رہے ہیں پار ہو جا

ندی نے دھوپ سے کیا کہہ دیا روانی میں
اُجالے پاؤں پٹکنے لگے ہیں پانی میں

یہ کوئی اور ہی کردار ہے تمہاری طرح
تمہارا ذکر نہیں ہے مری کہانی میں

اب اتنی ساری شبوں کا حساب کون رکھے
بڑے ثواب کمائے گئے جوانی میں

چمکتا رہتا ہے سورج مکھی میں کوئی اور
مہک رہا ہے کوئی اور رات رانی میں

یہ موج موج نئی ہل چلیں سی کیسی ہیں
یہ کس نے پاؤں اُتارے اُداس پانی میں

میں سوچتا ہوں کوئی اور کاروبار کروں
کتاب کون خریدے گا اِس گرانی میں

○

موافق جو فضا تیار کی ہے
بڑی تدبیر سے ہموار کی ہے

یہاں تجھ مجھ کے حصے میں زیاں ہے
یہ دنیا درہم و دینار کی ہے

یقیں کیسے کروں میں مر چکا ہوں
مگر سرخی یہی اخبار کی ہے

سڑک پر وردیاں ہی وردیاں ہیں
کہ آمد پھر کسی تیوہار کی ہے

یہاں گونگی ہے میری ہر جسارت
ضرورت حاشیہ بردار کی ہے

یہ مٹی مٹیوں سے کچھ الگ ہے
کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے

اب اک دریا ہے اور پھر اک سمندر
ابھی تو صرف ندّی پار کی ہے

نہ جانے کس کی آمد کی خبر ہے
عجب حالت در و دیوار کی ہے

میں ہر دن کام کرنا چاہتا ہوں
مگر چھٹی تو بس اتوار کی ہے

تم اپنی سر بلندی پر ہو نازاں
میاں قیمت یہاں دستار کی ہے

اُسے اب کے وفاؤں سے گزر جانے کی جلدی تھی
مگر اِس بار مجھ کو اپنے گھر جانے کی جلدی تھی

ارادہ تھا کہ میں کچھ دیر طوفاں کا مزہ لیتا
مگر بے چارے دریا کو اُتر جانے کی جلدی تھی

میں اپنی مٹھیوں میں قید کر لیتا زمینوں کو
مگر میرے قبیلے کو بکھر جانے کی جلدی تھی

میں آخر کون سا موسم تمہارے نام کر دیتا
یہاں ہر ایک موسم کو گزر جانے کی جلدی تھی

وہ شاخوں سے جدا ہوتے ہوئے پتوں پہ ہنستے تھے
بڑے زندہ نظر تھے جن کو مر جانے کی جلدی تھی

میں ثابت کس طرح کرتا کہ ہر آئینہ جھوٹا ہے
کئی کم ظرف چہروں کو اُتر جانے کی جلدی تھی

موقع ہے اس بار روز منا تیوہار ، اللہ بادشاہ
اپنی ہے سرکار ساتوں دن اتوار ، اللہ بادشاہ

تیری اونچی ذات ، لشکر تیرے ساتھ ، تیرے سو سو ہاتھ
تو بھی ہے تیار ، ہم بھی ہیں تیار ، اللہ بادشاہ

سب کی اپنی فوج ، یہ مستی وہ موج ، سب ہیں راجا بھوج
شیخ ، مغل ، انصار ، سب ذہنی بیمار ، اللہ بادشاہ

دلّی تا لاہور ، جنگل چاروں اور ، جس کو دیکھو چور
کابل اور قندھار توڑ دے یہ دیوار ، اللہ بادشاہ

فرق نہ اِن کے بیچ ، یہ بندر وہ ریچھ ، سب کی رسّی کھینچ
سارے ہیں مکّار ، سب کو ٹھوکر مار ، اللہ بادشاہ

پڑھے لکھے بے کار ، دردر ہیں فن کار ، عالم فاضل خوار
جاہل ، ڈھور ، گنوار ، قوم کے ہیں سردار ، اللہ بادشاہ

○

شام ہوتی ہے تو پلکوں پہ سجاتا ہے مجھے
وہ چراغوں کی طرح روز جلاتا ہے مجھے

میں ہوں یہ کم تو نہیں ہے ترے ہونے کی دلیل
میرا ہونا ترا احساس دلاتا ہے مجھے

میں بھی غالبؔ کی طرح شہ کا مصاحب ہوں یہاں
ورنہ اِس شہر میں منہ کون لگاتا ہے مجھے

اب کسی شخص میں سچ سننے کی ہمت ہے کہاں
مشکلوں سے ہی کوئی پاس بٹھاتا ہے مجھے

کیسے محفوظ رکھوں خود کو عجائب گھر میں
جو بھی آتا ہے یہاں ہاتھ لگاتا ہے مجھے

جانے کیا بننا ہے تجھ کو مری گیلی مٹی
کوزہ گر روز بناتا ہے ، مٹاتا ہے مجھے

آب و دانہ کسی بگڑے ہوئے بچے کی طرح
میں جہاں شاخ پہ بیٹھوں کہ اُڑاتا ہے مجھے

○

خاک سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوتی
چھوٹی موٹی بات پہ ہجرت نہیں ہوتی

پہلے دیپ جلیں تو چرچے ہوتے تھے
اور اب شہر جلیں تو حیرت نہیں ہوتی

تاریخوں کی پیشانی پر مہر لگا
زندہ رہنا کوئی کرامت نہیں ہوتی

کوئی اور اُٹھا رکھتا ہے چھت کا بوجھ
دیواروں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی

سوچ رہا ہوں آخر کب تک جینا ہے
مر جاتا تو اتنی فرصت نہیں ہوتی

روٹی کی گولائی ناپا کرتا ہے
اسی لیے تو گھر میں برکت نہیں ہوتی

ہم نے ہی کچھ لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا
ورنہ غزل کی اتنی قلت نہیں ہوتی

مسواکوں سے چاند کا چہرہ چھوتا ہے
بیٹا اتنی سستی جنت نہیں ہوتی

بازاروں میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ چیزیں
جن چیزوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی

کوئی کیا دے رائے ہمارے بارے میں
ایسے ویسوں کی تو ہمت نہیں ہوتی

○

پرانے داؤں پر ہر دن نئے آنسو لگاتا ہے
وہ اب بھی اک پھٹے رومال پر خوشبو لگاتا ہے

اُسے کہہ دو کہ یہ اُونچائیاں مشکل سے ملتی ہیں
وہ سورج کے سفر میں موم کے بازو لگاتا ہے

میں کالی رات کے تیزاب سے سورج بناتا ہوں
مری چادر میں یہ پیوند اک جگنو لگاتا ہے

یہاں لچھمن کی ریکھا ہے نہ سیتا ہے مگر پھر بھی
بہت پھیرے ہمارے گھر کے اک سادھو لگاتا ہے

نمازیں مستقل پہچان بن جاتی ہے چہروں کی
تِلک جس طرح ماتھے پر کوئی ہندو لگاتا ہے

نہ جانے یہ انوکھا فرق اِس میں کس طرح آیا
وہ اب کالر میں پھولوں کی جگہ بچھو لگاتا ہے

اندھیرے اور اُجالے میں یہ سمجھوتہ ضروری ہے
نشانے ہم لگاتے ہیں ٹھکانے تو لگاتا ہے

○

پرانے لوگوں کے قصے نکالتا کیوں ہے
بھلائی کر کے سمندر میں ڈالتا کیوں ہے

یہ اُس سے کہہ دو کہ کاغذ کے پر بھی کافی ہیں
وہ روز مجھ کو ہوا میں اُچھالتا کیوں ہے

کہیں ملے گا تو اک بات اُس سے پوچھوں گا
وہ مار ڈالے گا ہم کو تو پالتا کیوں ہے

سفید دودھ ، سیہ زہر ، ہو کہ سرخ شراب
میں پی چکا ہوں تو ساغر کھنگالتا کیوں ہے

یہاں تو چاروں طرف کوئلے کی کانیں ہیں
بچا نہ پائے گا ، کپڑے سنبھالتا کیوں ہے

مری غزل کو غزل ہی سمجھ تو بہتر ہے
مری غزل سے کوئی رخ نکالتا کیوں ہے

یوں لمحہ لمحہ سہاروں کا قرض دار نہ کر
گِرانا ہے تو گرا دے ، سنبھالتا کیوں ہے

○

موسموں کا خیال رکھا کرو
کچھ لہو میں اُبال رکھا کرو

زندگی روز مرتی رہتی ہے
ٹھیک سے دیکھ بھال رکھا کرو

سب لکیروں پہ چھوڑ رکھا ہے
آپ بھی کچھ کمال رکھا کرو

یاد کرتے رہا کرو ماضی
ایک اک پل اُجال رکھا کرو

جانے کب سچ کا سامنا ہو جائے
کوئی رستہ نکال رکھا کرو

غالبوں کو رکھو دماغوں میں
دل یگانہ مثال رکھا کرو

صلح کرتے رہا کرو ہر پل
دشمنوں کو نڈھال رکھا کرو

خالی خالی اُداس اُداس آنکھیں
اِن میں کچھ خواب پال رکھا کرو

پھر وہ چاقو چلا نہیں سکتا
ہاتھ گردن میں ڈال رکھا کرو

لاکھ سورج سے دوستانہ ہو
چند جگنو بھی پال رکھا کرو

○

مرغ ماہی کباب زندہ باد
ہر سند ، ہر خطاب زندہ باد

میری بستی میں ایک دو اندھے
پڑھ چکے ہر کتاب زندہ باد

یارا اپنا ہے کیا رہے نہ رہے
شہر کی آب و تاب زندہ باد

سیکھ لیتے ہیں گونگے بہرے بھی
نعرۂ انقلاب زندہ باد

روئی کی تتلیاں سلامت باش
کاغذوں کے گلاب زندہ باد

لاکھ پردوں میں رہنے والے تم
آج کل بے نقاب زندہ باد

پھر پرانی لتیں، پرانے شوق
پھر پرانی شراب زندہ باد

دن نمازیں، نصیحتیں، فتوے
رات چنگ و رباب زندہ باد

روز دو، چار، چھے گناہ کرو
روز کارِ ثواب زندہ باد

تو نے دنیا جوان رکھی ہے
اے بزرگ آفتاب زندہ باد

O

اُونگھتی رہ گزر کے بارے میں
لوگ پوچھیں گے گھر کے بارے میں

میل کے پتھروں سے پوچھتا ہوں
اپنے اک ہم سفر کے بارے میں

مشورہ کر رہے ہیں آپس میں
چند جگنو ، سحر کے بارے میں

ایک سچی خبر سنانی ہے
ایک جھوٹی خبر کے بارے میں

انگلیوں سے لہو ٹپکتا ہے
کیا لکھیں چارہ گر کے بارے میں

لاکھ وہ گم شدہ سہی لیکن
جانتا ہے خضر کے بارے میں

بوڑھے ہوئے یہاں کئی عیاش بمبئی
تو آج بھی جوان ہے ، شاباش بمبئی

پوچھوں کہ میرے بچوں کے خوابوں کا کیا ہوا
مل جائے بمبئی میں کہیں کاش بمبئی

دل بیٹھتے ہیں دوڑتے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ
سونے کی فصل بوتی ہے قلاش بمبئی

دو گز زمین بھی نہ ملی دفن کے لیے
گھر میں پڑی ہوئی ہے تری لاش بمبئی

ہر شخص آ کے جیت نہ پائے گا بازیاں
اُلٹے چھپے ہوئے ہیں ترے تاش بمبئی

اِس شہر میں زمین ہے مہنگی بہت مگر
گھر کی چھتوں پہ رکھتی ہے آکاش بمبئی

ہوا خود اب کے ہوا کے خلاف ہے جانی
دیے جلاؤ ، کہ میدان صاف ہے جانی

ہمیں چمکتی ہوئی سردیوں کا خوف نہیں
ہمارے پاس پرانا لحاف ہے جانی

وفا کا نام یہاں ہو چکا بہت بدنام
میں بے وفا ہوں مجھے اعتراف ہے جانی

ہے اپنے رشتوں کی بنیاد جن شرائط پر
وہیں سے تیرا مرا اختلاف ہے جانی

وہ میری پیٹھ میں خنجر اُتار سکتا ہے
کہ جنگ میں تو سبھی کچھ معاف ہے جانی

میں جاہلوں میں بھی لہجہ بدل نہیں سکتا
مری اثاثہ یہی شین قاف ہے جانی

○

تیرا میرا نام خبر میں رہتا تھا
دن بیتے ، اک سودا سر میں رہتا تھا

میرا رستہ تکتا تھا اک چاند کہیں
میں سورج کے ساتھ سفر میں رہتا تھا

سارے منظر گورے گورے لگتے تھے
جانے کس کا روپ نظر میں رہتا تھا

میں نے اکثر آنکھیں موندے دیکھا ہے
اک منظر جو پس منظر میں رہتا تھا

کاٹھ کی کشتی پیٹھ تھپکتی رہتی تھی
دریاؤں کا پاؤں بھنور میں رہتا تھا

اُجلی اُجلی تصویریں سی بنتی ہیں
سنتے ہیں اللہ بشر میں رہتا تھا

میلوں تک ہم چڑیوں سے اُڑ جاتے تھے
کوئی میرے ساتھ سفر میں رہتا تھا

ستاتی ہے گرمی جس کے سائے میں
یہ پودا کل دھوپ نگر میں رہتا تھا

دھرتی سے جب خود کو جوڑے رہتے تھے
یہ سارا آکاش اثر میں رہتا تھا

سچ کا بوجھ اُٹھائے ہوں اب پلکوں پر
پہلے میں بھی خواب نگر میں رہتا تھا

○

مجھ میں کتنے راز ہیں بتلاؤں کیا؟
بند اک مدت سے ہوں کھل جاؤں کیا؟

عاجزی ، منت ، خوشامد ، التجا
اور میں کیا کیا کروں مر جاؤں کیا؟

کل یہاں میں تھا جہاں تم آج ہو
میں تمہاری ہی طرح اِتراؤں کیا؟

تیرے جلسے میں ترا پرچم لیے
سیکڑوں لاشیں بھی ہیں گنواؤں کیا؟

ایک پتھر ہے وہ میری راہ کا
گر نہ ٹھکراؤں تو ٹھوکر کھاؤں کیا؟

پھر جگایا تو نے سوئے شیر کو
پھر وہی لہجہ درازی! آؤں کیا؟

در بہ در جو تھے وہ دیواروں کے مالک ہو گئے
میرے سب دربان درباروں کے مالک ہو گئے

لفظ گونگے ہو چکے ، تحریر اندھی ہو چکی
جتنے مخبر تھے وہ اخباروں کے مالک ہو گئے

لال سورج آسماں سے گھر کی چھت پر آ گیا
جتنے تھے بے کار سب کاروں کے مالک ہو گئے

اور اپنے گھر میں ہم بیٹھے رہے مشعل بہ کف
چند جگنو چاند اور تاروں کے مالک ہو گئے

دیکھتے ہی دیکھتے کتنی دکانیں کھل گئیں
بکنے آئے تھے وہ بازاروں کے مالک ہو گئے

سر بہ کف تھے تو سروں سے ہاتھ دھونا پڑ گیا
سر جھکائے تھے وہ دستاروں کے مالک ہو گئے

○

دو گز ٹکڑا اُجلے اُجلے بادل کا
یاد آتا ہے ایک دوپٹا ململ کا

شہر کے منظر دیکھ کے چیخا کرتا ہے
میرے اندر اک سناٹا جنگل کا

بادل، ہاتھی، گھوڑے لے کر آتے ہیں
لیکن اپنا رستہ تو ہے پیدل کا

مجھ سے آ کر میری زباں میں بات کرے
لکھتا رہتا ہے جو کھاتا ہر پل کا

آتے جاتے اندھی آنکھیں پڑھتی ہیں
ہر پتھر پر نام لکھا ہے مخمل کا

کھلے کھلے سے رہنے کے ہم عادی ہیں
دھیان کسے ہے دروازے کی سانکل کا

دیکھیں کس دن پہنچو گے تم تاروں تک
اُونچائی تک اک سفر ہے دَل دَل کا

گیلا دامن ، گیلی گیلی آنکھیں ہیں
ہر موسم میں اک موسم ہے جل تھل کا

مجھ کو اپنے رنگ میں ڈھالا دنیا نے
سانپ ہوا ہوں خود ہی اپنے صندل کا

دیکھیں کتنا بازاروں میں آئے اُچھال
ہم سونا ہیں اور زمانہ پیتل کا

دعاؤں میں وہ تمھیں یاد کرنے والا ہے
کوئی فقیر کی امداد کرنے والا ہے

یہ سوچ سوچ کے شرمندگی سی ہوتی ہے
وہ حکم دے گا جو فریاد کرنے والا ہے

زمین ہم بھی ترے وارثوں میں ہیں کہ نہیں
وہ اِس سوال کو بنیاد کرنے والا ہے

یہی زمین مجھے گود لینے والی ہے
یہ آسماں مری امداد کرنے والا ہے

یہ وقت تو جسے برباد کرتا رہتا ہے
یہ وقت بھی تجھے برباد کرنے والا ہے

خدا دراز کرے عمر میرے دشمن کی
کوئی تو ہے جو مجھے یاد کرنے والا ہے

سبب وہ پوچھ رہے ہیں اُداس ہونے کا
مرا مزاج نہیں بے لباس ہونے کا

نیا بہانہ ہے ہر پل اُداس ہونے کا
یہ فائدہ ہے ترے گھر کے پاس ہونے کا

مہکتی رات کے لمحو! نظر رکھو مجھ پر
بہانا ڈھونڈ رہا ہوں اُداس ہونے کا

میں تیرے پاس بتا کس غرض سے آیا ہوں
ثبوت دے مجھے چہرہ شناس ہونے کا

مری غزل سے بنا ذہن میں کوئی تصویر
سبب نہ پوچھ مرے دیوداس ہونے کا

کہاں ہو آؤ مری بھولی بسری یادو! آؤ
خوش آمدید ، ہے موسم اُداس ہونے کا

کئی دنوں سے طبیعت مری اُداس نہ تھی
یہی جواز بہت ہے اُداس ہونے کا

میں اہمیت بھی سمجھتا ہوں قہقہوں کی مگر
مزا کچھ اپنا الگ ہے اُداس ہونے کا

مرے لبوں سے تبسم مذاق کرنے لگا
میں لکھ رہا تھا قصیدہ اُداس ہونے کا

پتا نہیں یہ پرندے کہاں سے آ پہنچے
ابھی زمانہ کہاں تھا اُداس ہونے کا

میں کہہ رہا ہوں کہ اے دل اِدھر اُدھر نہ بھٹک
گزر نہ جائے زمانہ اُداس ہونے کا

اندھیرے چاروں طرف سائیں سائیں کرنے لگے
چراغ ہاتھ اُٹھا کر دعائیں کرنے لگے

ترقی کر گئے بیماروں کے سوداگر
یہ سب مریض ہیں جو اب دوائیں کرنے لگے

لہولہان پڑا تھا زمین پر اک سورج
پرندے اپنے پروں سے ہوائیں کرنے لگے

زمیں پر آ گئے آنکھوں سے ٹوٹ کر آنسو
بری خبر ہے فرشتے خطائیں کرنے لگے

جھلس رہے ہیں یہاں چھاؤں بانٹنے والے
وہ دھوپ ہے کہ شجر اِلتجائیں کرنے لگے

عجیب رنگ تھا مجلس کا ، خوب محفل تھی
سفید پوش اُٹھے کائیں کائیں کرنے لگے

اگر خلاف ہے ہونے دو جان تھوڑی ہے
یہ سب دُھواں ہے کوئی آسمان تھوڑی ہے

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

میں جانتا ہوں کہ دشمن بھی کم نہیں لیکن
ہماری طرح ہتھیلی پہ جان تھوڑی ہے

جو آج صاحبِ مسند ہیں کل نہیں ہوں گے
کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے

ہمارے منہ سے جو نکلے وہی صداقت ہے
ہمارے منہ میں تمہاری زبان تھوڑی ہے

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

○

برچھی لے کر چاند نکلنے والا ہے
گھر چلیے اب سورج ڈھلنے والا ہے

منظر نامہ وہی پرانا ہے لیکن
ناٹک کا عنوان بدلنے والا ہے

طور طریقے بدلے نرم اُجالوں نے
ہر جگنو اب آگ اُگلنے والا ہے

دھوپ کے ڈر سے کب تک گھر میں بیٹھو گے
سورج تو ہر روز نکلنے والا ہے

ایک پرانے کھیل کھلونے جیسی ہے
دنیا سے اب کون بہلنے والا ہے

دہشت کا ماحول ہے ساری بستی میں
کیا کوئی اخبار نکلنے والا ہے

بے سمتی کا مارا میرا ننھا پن
بھیڑ کے پیچھے پیچھے چلنے والا ہے

سب کو دُکھ سے مُکتی ملنے والی ہے
بوتل سے اک دیو نکلنے والا ہے

مہنگی قالینیں لے کر کیا کیجیے گا
اپنا گھر بھی اک دن جلنے والا ہے

ساری سڑکیں ماتم کرتی رہتی ہیں
ہر بچہ رسی پر چلنے والا ہے

رات کی دھڑکن جب تک جاری رہتی ہے
سوتے نہیں ہم ذمے داری رہتی ہے

جب سے تو نے ہلکی ہلکی باتیں کیں
یار طبیعت بھاری بھاری رہتی ہے

پاؤں کمر تک دھنس جاتے ہیں دھرتی میں
ہاتھ پسارے جب خودداری رہتی ہے

وہ منزل پر اکثر دیر سے پہنچے ہیں
جن لوگوں کے پاس سواری رہتی ہے

چھت سے اُس کی دھوپ کے نیزے آتے ہیں
جب آنگن میں چھاؤں ہماری رہتی ہے

گھر کے باہر ڈھونڈتا رہتا ہوں دنیا
گھر کے اندر دنیا داری رہتی ہے

○

ایک دو آسمان اور سہی
اور تھوڑی اُڑان اور سہی

شہر آباد ہوں درندوں سے
جنگلوں میں مچان اور سہی

دھوپ کو نیند آ بھی سکتی ہے
چھاؤں کی داستان اور سہی

بارشو! حوصلے بلند رہیں
میرا کچا مکان اور سہی

یہ پسینہ تو اپنی پونجی ہے
چند مٹھی لگان اور سہی

گالیوں سے نوازتا ہے تجھے
ایک اہلِ زبان اور سہی

شہر میں امن ہے کئی دن سے
کوئی تازہ بیان اور سہی

ہر دنیا سے، قبیلے سے لڑائی لیتے
ایک سچ کے لیے کس کس سے برائی لیتے

آبلے اپنے ہی انگاروں کے تازہ ہیں ابھی
لوگ کیوں آگ ہتھیلی پہ پرائی لیتے

برف کی طرح دسمبر کا سفر ہوتا ہے
ہم اُسے ساتھ نہ لیتے تو رضائی لیتے

کتنا مانوس سا ہم دردوں کا یہ درد رہا
عشق کا روگ نہیں تھا جو دوائی لیتے

چاند تاروں میں ہمیں ڈستا ہے دن میں سورج
شرم آتی ہے اندھیروں سے کمائی لیتے

تم نے جو توڑ دیے خواب ہم اُن کے بدلے
کوئی قیمت کبھی لیتے تو خدائی لیتے

تو کیا بارش بھی زہریلی ہوئی ہے
ہماری فصل کیوں نیلی ہوئی ہے

یہ کس نے بال کھولے موسموں کے
ہوا کیوں اتنی برفیلی ہوئی ہے

کسی دن پوچھیے سورج مکھی سے
کہ رنگت کس لیے پیلی ہوئی ہے

سفر کا لطف بڑھتا جا رہا ہے
زمیں کچھ اور پتھریلی ہوئی ہے

سنہری لگ رہا ہے ایک اک پل
کئی صدیوں میں تبدیلی ہوئی ہے

دکھایا ہے اگر سورج نے غصہ
تو بالو اور چمکیلی ہوئی ہے

خاک ہونا طے ہوا اب خاکساری کے لیے
یہ دکاں ہم نے لگائی تھی اُدھاری کے لیے

کچھ پلوں کی تتلیوں کے رنگ میرے سنگ ہیں
چند خوشیاں ہیں غموں کی پاس داری کے لیے

داؤں پر لگنے لگی ہیں عزتیں سادات کی
عشق کی راہیں بہت آساں ہیں خواری کے لیے

اک سمندر اپنے ہی اندر ڈبوتا ہے مجھے
ایک کشتی چاہیے مجھ کو سواری کے لیے

دھڑکنیں پل بھر بھی دل سے دور رہ سکتی نہیں
دیویاں پاگل ہوئی ہیں اک پجاری کے لیے

تجربہ اپنا اسدؔ سے کچھ الگ ہے دوستو!
مے ضروری شے ہے یک گونا خماری کے لیے

○

آنکھ میں پانی رکھو، ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو

راہ کے پتھر سے بڑھ کر کچھ نہیں ہیں منزلیں
راستے آواز دیتے ہیں سفر جاری رکھو

ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو!
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو

آتے جاتے پل یہ کہتے ہیں ہمارے کان میں
کوچ کا اعلان ہونے کو ہے تیاری رکھو

یہ ضروری ہے کہ آنکھوں کا بھرم قائم رہے
نیند رکھو یا نہ رکھو خواب معیاری رکھو

یہ ہوائیں اُڑ نہ جائیں لے کے کاغذ کا بدن
دوستو! مجھ پر کوئی پتھر ذرا بھاری رکھو

لے تو آئے شاعری بازار میں راحت میاں
کیا ضروری ہے کہ لہجے کو بھی بازاری رکھو

○

چراغوں کو اُچھالا جا رہا ہے
ہوا پر رعب ڈالا جا رہا ہے

نہ ہار اپنی ، نہ اپنی جیت ہو گی
مگر سکہ اُچھالا جا رہا ہے

وہ دیکھو مے کدے کے راستے میں
کوئی اللہ والا جا رہا ہے

تھے پہلے ہی کئی سانپ آستیں میں
اب اک بچھو بھی پالا جا رہا ہے

مرے جھوٹے گلاسوں کی چکھا کر
بہکتوں کو سنبھالا جا رہا ہے

ہمی بنیاد کا پتھر ہیں لیکن
ہمیں گھر سے نکالا جا رہا ہے

جنازے پر مرے لکھ دینا یارو!
محبت کرنے والا جا رہا ہے

○

یہ سرد راتیں بھی بن کر ابھی دُھواں اُڑ جائیں
وہ اک لحاف میں اوڑھوں تو سردیاں اُڑ جائیں

خدا کا شکر کہ میرا مکاں سلامت ہے
ہیں اتنی تیز ہوائیں کہ بستیاں اُڑ جائیں

زمیں سے ایک تعلق نے باندھ رکھا ہے
بدن میں خون نہیں ہو تو ہڈیاں اُڑ جائیں

بکھر بکھر سی گئی ہے کتاب سانسوں کی
یہ کاغذات خدا جانے کب کہاں اُڑ جائیں

رہے خیال کہ مجذوبِ عشق ہیں ہم لوگ
اگر زمین سے پھونکیں تو آسماں اُڑ جائیں

ہوائیں باز کہاں آتی ہیں شرارت سے
سروں پہ ہاتھ نہ رکھیں تو پگڑیاں اُڑ جائیں

بہت غرور ہے دریا کو اپنے ہونے پر
جو میری پیاس سے اُلجھے تو دھجیاں اُڑ جائیں

○

اِس سے پہلے کہ ہوا شور مچانے لگ جائے
میرے اللہ مری خاک ٹھکانے لگ جائے

گھیرے رہتے ہیں کئی خواب میری آنکھوں کو
کاش کچھ دیر مجھے نیند بھی آنے لگ جائے

تو ضروری ہے کہ میں مصر سے ہجرت کر جاؤں
جب زلیخا ہی مرے دام گھٹانے لگ جائے

سال بھر عید کا رستہ نہیں دیکھا جاتا
وہ گلے مجھ سے کسی اور بہانے لگ جائے

میری کوشش ہے کہ ہر شام یہ ڈھلتا سورج
شب کی دہلیز پہ اک شمع جلانے لگ جائے

خشک دریاؤں میں ہلکی سی روانی اور ہے
ریت کے نیچے ابھی تھوڑا سا پانی اور ہے

بوریے پر بیٹھیے کلھڑ میں پانی پیجئے
ہم قلندر ہیں ہماری میزبانی اور ہے

اک کہانی ختم کر کے وہ بہت ہے مطمئن
بھول بیٹھا ہے کہ آگے اک کہانی اور ہے

کون پھر پوچھے گا گونگے منصفوں سے خیریت
ایک لے دے کے ہماری بے زبانی اور ہے

ایک دن اِس شہر کی قیمت لگائی جائے گی
گاؤں میں تھوڑی بہت کھیتی کسانی اور ہے

جو بھی ملتا ہے اُسے اپنا سمجھ لیتا ہوں میں
ایک بیماری مجھے یہ خاندانی اور ہے

دلوں میں آگ ، لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
سب اپنے چہروں پہ دوہری نقاب رکھتے ہیں

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں

بہت سے لوگ کہ جو حرف آشنا بھی نہیں
اِسی میں خوش ہیں کہ تیری کتاب رکھتے ہیں

یہ مے کدہ ہے، وہ مسجد ہے، وہ ہے بت خانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

ہمارے شہر کے منظر نہ دیکھ پائیں گے
یہاں کے لوگ تو آنکھوں میں خواب رکھتے ہیں

چہروں کی دھوپ، آنکھوں کی گہرائی لے گیا
آئینہ سارے شہر کی بینائی لے گیا

ڈوبے ہوئے جہاز پہ کیا تبصرہ کریں
یہ حادثہ تو سوچ کی گہرائی لے گیا

حالاں کہ بے زبان تھا لیکن عجیب تھا
جو شخص مجھ سے چھین کے گویائی لے گیا

میں آج اپنے گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس اک قمیص تھی جو مرا بھائی لے گیا

غالبؔ تمہارے واسطے اب کچھ نہیں رہا
گلیوں کے سارے سنگ تو سودائی لے گیا

○

آنکھ پیاسی ہے کوئی منظر دے
اِس جزیرے کو بھی سمندر دے

اپنا چہرہ تلاش کرنا ہے
گر نہیں آئینہ تو پتھر دے

بند کلیوں کو چاہیے شبنم
اِن چراغوں میں روشنی بھر دے

ایک دوزخ جو سب جلا ڈالے
ایک جگنو جو روشنی کر دے

میرے ہونٹوں پہ چاند تارے لکھ
میری سوچوں میں شاعری بھر دے

پتھروں کے سروں سے قرض اُتار
اِس صدی کو کوئی پیمبر دے

قہقہوں میں گزر رہی ہے حیات
اب کسی دن اُداس بھی کر دے

پھر نہ کہنا کہ خودکشی ہے گناہ
آج فرصت ہے فیصلہ کر دے

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی ، گلا اپنا ، غزل اُستاد کی

اپنی سانسیں بیچ کر میں نے جسے آباد کی
وہ گلی جنت تو اب بھی ہے مگر شداد کی

عمر بھر چلتے رہے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
زندگی کو ڈھونڈنے میں زندگی برباد کی

داستانوں کے سبھی کردار گم ہونے لگے
آج کاغذ چنتی پھرتی ہے پری بغداد کی

اک سلگتا ، چیختا ، ماحول ہے اور کچھ نہیں
بات کرتے ہو یگانہ کس امین آباد کی

○

یہ سانحہ تو کسی دن گزرنے والا تھا
میں بچ بھی جاتا تو اک روز مرنے والا تھا

ترے سلوک ، تری آگہی کی عمر دراز
مرے عزیز مرا زخم بھرنے والا تھا

بلندیوں کا نشہ ٹوٹ کر بکھرنے لگا
مرا جہاز زمیں پر اُترنے والا تھا

مرا نصیب مرے ہاتھ کٹ گئے ورنہ
میں تیری مانگ میں سیندر بھرنے والا تھا

مرے چراغ ، مری شب ، مری منڈیریں ہیں
میں کب شریر ہواؤں سے ڈرنے والا تھا

○

ساری بستی قدموں میں ہے، یہ بھی اک فن کاری ہے
ورنہ بدن کو چھوڑ کے اپنا جو کچھ ہے سرکاری ہے

کالج کے سب لڑکے چپ ہیں، کاغذ کی اک ناؤ لیے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی بے کاری ہے

پھولوں کی خوشبو لوٹی ہے، تتلی کے پر نوچے ہیں
یہ رہزن کا کام نہیں ہے، رہبر کی مکاری ہے

ہم نے دو سو سال سے گھر میں توتے پال کے رکھے ہیں
میر تقی کے شعر سنانا ، کون بڑی فن کاری ہے

اب پھرتے ہیں ہم رشتوں کے رنگ برنگے زخم لیے
سب سے ہنس کر ملنا جلنا بہت بڑی بیماری ہے

دولت بازو ، حکمت گیسو ، شہرت ماتھا ، غیبت ہونٹ
اِس عورت سے بچ کر رہنا ، یہ عورت بازاری ہے

کشتی پر آنچ آ جائے تو ہاتھ قلم کروا دینا
لاؤ! مجھے پتواریں دے دو ، میری ذمہ داری ہے

شہروں شہروں گاؤں کا آنگن یاد آیا
جھوٹے دوست اور سچا دشمن یاد آیا

پیلی پیلی فصلیں دیکھ کے کھیتوں میں
مٹی کا اک خالی برتن یاد آیا

گِرجا میں اک موم کی مریم رکھی تھی
ماں کی گود میں گزرا بچپن یاد آیا

دیکھ کے رنگ محل کی رنگیں دیواریں
اپنے گھر کا سونا آنگن یاد آیا

جنگل سر پہ رکھ کے سارا دن بھٹکے
رات ہوئی تو راج سنگھاسن یاد آیا

○

اپنے ہونے کا ہم اِس طرح پتا دیتے تھے
خاک مٹھی میں اُٹھاتے تھے اُڑا دیتے تھے

بے ثمر جان کے ہم کاٹ چکے ہیں جو شجر
یاد آتے ہیں کہ بے چارے ہوا دیتے تھے

اُس کی محفل میں وہی سچ تھا وہ جو کچھ بھی کہے
ہم بھی گونگوں کی طرح ہاتھ اُٹھا دیتے تھے

اب مرے [illegible]
جو مجھے پھولنے پھلنے کی دعا دیتے تھے

اب سے پہلے کے جو قاتل تھے بہت اچھے تھے
قتل سے پہلے وہ پانی تو پلا دیتے تھے

وہ ہمیں کوستا رہتا تھا زمانے بھر میں
اور ہم اپنا کوئی شعر سنا دیتے تھے

گھر کی تعمیر میں ہم برسوں رہے ہیں پاگل
روز دیوار اُٹھاتے تھے گرا دیتے تھے

ہم بھی اب جھوٹ کی پیشانی کو بوسہ دیں گے
تم بھی سچ بولنے والوں کو سزا دیتے تھے

○

کسی آہو کے لیے دور تلک مت جانا
شاہ زادے کہیں جنگل میں بھٹک مت جانا

امتحاں لیں گے یہاں صبر کا دنیا والے
مری آنکھوں! کہیں ایسے میں چھلک مت جانا

زندہ رہنا ہے تو سڑکوں پہ نکلنا ہو گا
گھر کے بوسیدہ کنواڑوں سے چپک مت جانا

قینچیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں بدن خوشبو کا
خارِ صحرا، کہیں بھولے سے مہک مت جانا

اے چراغو! تمھیں جلنا ہے سحر ہونے تک
کہیں منہ زور ہواؤں سے چمک مت جانا

○

کالی راتوں کو بھی رنگین کہا ہے میں نے
تیری ہر بات پہ آمین کہا ہے میں نے

تیری دستار پہ تنقید کی ہمت تو نہیں
اپنی پاپوش کو قالین کہا ہے میں نے

مصلحت کہیے اسے یا کہ سیاست کہیے
چیل کوؤں کو بھی شاہین کہا ہے میں نے

ذائقے بارہا آنکھوں میں مزا دیتے ہیں
بعض چہروں کو بھی نمکین کہا ہے میں نے

تو نے فن کی نہیں شجرے کی حمایت کی ہے
تیرے اعزاز کو توہین کہا ہے میں نے

O

جھوٹی بلندیوں کا دُھواں پار کر کے آ
قد ناپنا ہے میرا تو چھت سے اُتر کے آ

اس پار منتظر ہیں تیر خوش نصیبیاں
لیکن یہ شرط ہے کہ ندی پار کر کے آ

کچھ دور میں بھی دوشِ ہوا پر سفر کروں
کچھ دور تو بھی خاک کی صورت بکھر کے آ

میں دُھول میں اَٹا ہوں مگر تجھ کو کیا ہوا
آئینہ دیکھ ، جا ذرا گھر جا ، سنور کے آ

سونے کا رتھ فقیر کے در تک نہ آئے گا
کچھ مانگتا ہے ہم سے تو پیدل اُتر کے آ

○

دھوکا مجھے دیئے پہ ہوا آفتاب کا
ذکرِ شراب میں بھی نشہ ہے شراب کا

جی چاہتا ہے بس اُسے پڑھتے ہی جایئے
چہرہ ہے یا ورق ہے خدا کی کتاب کا

سورج مکھی کے پھول سے شاید پتا چلے
منہ جانے کس نے چوم لیا آفتاب کا

مٹی تجھے سلام کہ تیرے ہی فیض سے
آنگن میں مسکراتا ہے پودا گلاب کا

اُٹھو، اے چاند تارو، اے شب کے سپاہیو!
آواز دے رہا ہے لہو آفتاب کا

○

ہنستے رہتے ہیں مسلسل ہم تم
ہو نہ جائیں کہیں پاگل ہم تم

پیاس صدیوں کی لیے آنکھوں میں
دیکھتے رہتے ہیں بادل ہم تم

رات ہوتے ہی سجا لیتے ہیں
اپنی آواز کا مقتل ہم تم

دھوپ ہم نے ہی اُگائی ہے جہاں
ہیں اُسی راہ کا پیپل ہم تم

اُڑتی پھرتی ہے ہواؤں میں زمیں
رینگتے پھرتے ہیں پیدل ہم تم

گھومتے رہتے ہیں شہروں شہروں
سر پہ رکھے ہوئے جنگل ہم تم

درمیاں ہوں نہ اگر بیچ کے لوگ
ڈھونڈ لیں اپنا کوئی حل ہم تم

جیسے دریا ، کسی دریا سے ملے
آؤ ہو جائیں مکمل ، ہم تم

○

رشتہ رشتہ سایۂ دیوار و در میں قید ہوں
میرا دکھ یہ ہے کہ میں اپنے ہی گھر میں قید ہوں

میں اسی پتھر میں ہوں سویا ہوا اک شاہ کار
ہاں مگر اب تک کسی دستِ ہنر میں قید ہوں

اَن گنت شہروں کے زندانوں کا پانی پی چکا
میں، کہ اک مدت سے زنجیرِ سفر میں قید ہوں

میری سانسوں کی سلاخیں، ہیں اُفق سے تا اُفق
میں ازل سے گردشِ شام و سحر میں قید ہوں

میرے پتھر، میرا سینہ، میرے ناخن، میرے زخم
میں کوئی سودا ہوں اور اپنے ہی سر میں قید ہوں

○

ساتھ منزل تھی، مگر خوف و خطر ایسا تھا
عمر بھر چلتے رہے لوگ، سفر ایسا تھا

جب وہ آئے تو میں خوش بھی ہوا، شرمندہ بھی
میری تقدیر تھی ایسی، مرا گھر ایسا تھا

حفظ تھیں مجھ کو بھی چہروں کی کتابیں کیا کیا
دل شکستہ تھا مگر تیز نظر ایسا تھا

آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ
دھوپ کے شہر میں اک تنہا شجر ایسا تھا

لوگ خود اپنے چراغوں کو بجھا کر سوئے
شہر میں تیز ہواؤں کا اثر ایسا تھا

○

ساری فطرت تو نقابوں میں چھپا رکھی تھی
صرف تصویر اُجالے میں لگا رکھی تھی

ہم دیا رکھ کے چلے آئے ہیں دیکھیں کیا ہو
اُس دریچے پہ تو پہلے سے ہوا رکھی تھی

رات ہم اپنے خداؤں کے لیے لڑتے رہے
وہ بھی نشے میں تھا، میں نے بھی لگا رکھی تھی

میری گردن پہ تھی تلوار مرے دشمن کی
میرے بازو پہ مری ماں کی دعا رکھی تھی

شہر میں رات مرا تعزیتی جلسہ تھا
سب نمازی تھے مگر سب نے لگا رکھی تھی

○

زندگی بھر دور رہنے کی سزائیں رہ گئیں
میرے حصہ میں مری ساری وفائیں رہ گئیں

نوجواں بیٹوں کو شہروں کے تماشے لے اُڑے
گاؤں کی جھولی میں کچھ مجبور مائیں رہ گئیں

بجھ گیا وحشی کبوتر کی ہوس کا گرم خون
نرم بستر پر تڑپتی فاختائیں رہ گئیں

ایک اک کرکے ہوئے رخصت مرے کنبے کے لوگ
گھر کے سناٹے سے ٹکراتی ہوائیں رہ گئیں

بادہ خانے، شاعری، نغمے، لطیفے، رَت جگے
اپنے حصے میں یہی دیسی دوائیں رہ گئیں

○

ابھی خواہشیں سینے میں دبا بھی نہ سکوں
ایسے ضدی ہیں پرندے کہ اُڑا بھی نہ سکوں

پھونک ڈالوں گا کسی روز میں دل کی دنیا
یہ ترا خط، تو نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں

مری غیرت بھی کوئی شے ہے کہ محفل میں بھی
اُس نے اس طرح بلایا ہے کہ جا بھی نہ سکوں

پھل تو سب میرے درختوں کے پکے ہیں لیکن
اتنی کم زور ہیں شاخیں کہ ہلا بھی نہ سکوں

اک نہ اک روز کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا تجھ کو
ٹھوکریں زہر نہیں ہیں کہ میں کھا بھی نہ سکوں

○

شہ کا نوکر نہ کہے ، شہ کا مصاحب سمجھے
اُس کی خواہش ہے کہ دنیا اُسے غالبؔ سمجھے

میرا کیا مول ہے ، یہ فیصلہ تجھ پہ چھوڑا
مجھے منظور ہے تو جو بھی مناسب سمجھے

بادشاہوں کے قصیدوں سے کتابیں بھر دیں
کم نظر لوگ تھے ذرّوں کو کواکب سمجھے

میں نے جو کچھ بھی لکھا ، اپنے لیے لکھا تھا
یہ الگ بات کہ وہ خود کو مخاطب سمجھے

ہمیں دربار میں آنے کی اجازت ہی نہیں
ہم نہ اعزاز ، نہ عہدہ ، نہ مراتب سمجھے

روز تاروں کی نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے، اندھیرے میں نکل پڑتا ہے

ایک دیوانہ مسافر ہے مری آنکھوں میں
وقت بے وقت ٹھہر جاتا ہے، چل پڑتا ہے

اپنی تعبیر کے چکر میں مرا جاگتا خواب
روز سورج کی طرح گھر سے نکل پڑتا ہے

روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

اُس کی یاد آئی ہے، سانسوں ذرا آہستہ چلو!
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

○

پھول جیسے مخملیں تلووَں میں چھالے کر دیے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کر دیے

پیاس اب کیسے بجھے گی ہم نے خود ہی بھول سے
مے کدے کم ظرف لوگوں کے حوالے کر دیے

دیکھ کر تجھ کو کوئی منظر نہ دیکھا عمر بھر
اک اُجالے نے مری آنکھوں میں جالے کر دیے

روشنی کے دیوتا کو پوجتا تھا کل تلک
آج گھر کی کھڑکیوں کے کانچ کالے کر دیے

زندگی کا کوئی بھی تحفہ نہیں ہے میرے پاس
خون کے آنسو تو غزلوں کے حوالے کر دیے

○

تیرا احساس ہے جتنی بھی میسر کر دے
ہاں مگر اتنی ہو ساقی کے گلا تر کر دے

جھوٹ کو اپنے مرے سچ کے برابر کر دے
سامری تو ہے ، تو آ جا مجھے پتھر کر دے

دھوپ اور چھاؤں کے مالک مرے بوڑھے سورج
مرے سائے کو مرے قد کے برابر کر دے

امتحاں ظرف کا ہو جائے گا ساقی ، لیکن
پہلے ہم سب کے گلاسوں میں برابر کر دے

تیرے ہاتھوں میں ہے تلوار ، مرے لب پہ دعا
سورما ، آ ، مجھے میدان سے باہر کر دے

سارے بادل ہیں اُسی کے وہ اگر چاہے تو
میرے تپتے ہوئے صحرا کو سمندر کر دے

ہو نمازی کہ شرابی ، یہ کوئی شرط نہیں
وہ جسے چاہے مقدر کا سکندر کر دے

گاؤں کی بیٹی کی عزت تو بچا لوں لیکن
مجھے مکھیا نہ کہیں گاؤں سے باہر کر دے

○

جو شاخوں پر اُداسی کے برہنہ خط بناتے ہیں
ہم اُن سوکھے ہوئے پتّوں سے گھر کی چھت بناتے ہیں

فرشتے رنگ برساتے ہیں، موسم رقص کرتا ہے
جب اُڑتے بادلوں میں ہم تری صورت بناتے ہیں

سلگتی ریت پر دریا نے جن کا نام لکھا تھا
ہم اُن تشنہ لبوں کی یاد میں شربت بناتے ہیں

میں جن کے بولتے الفاظ کو گونگا سمجھتا ہوں
وہ بوڑھے ہونٹ میرے واسطے جنت بناتے ہیں

نہ جانے کون سی تخلیق کی معراج ہو جائے
ہم اپنے گھر میں اکثر روئی کے پربت بناتے ہیں

○

سمندروں میں موافق ہوا چلاتا ہے
جہاز خود نہیں چلتے ، خدا چلاتا ہے

یہ جا کے میل کے پتھر پہ کوئی لکھ آئے
وہ ہم نہیں ہیں جنہیں راستہ چلاتا ہے

وہ پانچ وقت نظر آتا ہے نمازوں میں
مگر سنا ہے کہ شب میں جوا چلاتا ہے

یہ لوگ پاؤں نہیں ذہن سے اپاہج ہیں
اُدھر چلیں گے جدھر رہ نما چلاتا ہے

ہم اپنے بوڑھے چراغوں پہ خوب اِترائے
اور اُس کو بھول گئے جو ہوا چلاتا ہے

○

سلگتے سارے چھپر لگ رہے ہیں
کہ سائے مقبروں پر لگ رہے ہیں

ببول آنگن میں بویا جا رہا ہے
پہاڑوں پر صنوبر لگ رہے ہیں

مگر اندر کوئی صحرا چھپا ہے
بہ ظاہر ہم سمندر لگ رہے ہیں

جہالت کو سند بخشی گئی ہے
ستارے پتھروں پر لگ رہے ہیں

بہت رنگیں طبیعت ہیں پرندے
درختوں پر کلینڈر لگ رہے ہیں

عقاب اُن میں کوئی ہو گا تو ہو گا
ہمیں تو سب کبوتر لگ رہے ہیں

یہاں دریا پہ پابندی نہیں ہے
مگر پہرے لبوں پر لگ رہے ہیں

خدا سے کام کوئی آ پڑا ہے
بہت مسجد کے چکر لگ رہے ہیں

○

سب ہنر اپنی برائی میں دکھائی دیں گے
عیب تو بس مرے بھائی میں دکھائی دیں گے

اُس کی آنکھوں میں نظر آئیں گے اتنے سورج
جیسے پیوند رضائی میں دکھائی دیں گے

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہیں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائی دیں گے

ذکر رشتوں کے تحفظ کا جو نکلے گا تو ہم
راجپوتوں کی کلائی میں دکھائی دیں گے

اور کچھ روز ہے جھیلوں پہ سلگتی ہوئی ریت
سبز منظر بھی جولائی میں دکھائی دیں گے

○

پیشانیوں پہ لکھے مقدر نہیں ملے
دستار کیا ملے، کہ جہاں سر نہیں ملے

سورج کے ساتھ ساتھ ہیں کتنی کہانیاں
مغرب کے بعد ہم بھی کبھی گھر نہیں ملے

کل آئینوں کا جشن ہوا تھا تمام رات
اندھے تماش بینوں کو پتھر نہیں ملے

میں چاہتا تھا خود سے ملاقات ہو مگر
آئینے میرے قد کے برابر نہیں ملے

حالاں کہ دوستوں سے بہت کم ملے ہیں ہم
لیکن کبھی نقاب لگا کر نہیں ملے

○

جب میں دنیا کے لیے بیچ کے گھر آیا تھا
اُن دنوں بھی مرے حصے میں صفر آیا تھا

کھڑکیاں بند نہ ہوتیں تو جھلس ہی جاتا
آگ اُگلتا ہوا سورج مرے گھر آیا تھا

آج سڑکوں پہ تصاویر بناتے رہیے
انگلیاں ٹوٹ چکیں جب یہ ہنر آیا تھا

جو کبھی ہوتا ہے صدیوں میں منور اک بار
وہ دیا مجھ کو کئی بار نظر آیا تھا

لوگ پیپل کے درختوں کو خدا کہنے لگے
میں ذرا دھوپ سے بچنے کو اِدھر آیا تھا

○

دھوپ ، سمندر چہرا ہے
منظر کتنا گہرا ہے

دیکھ چکے ہم سارا شہر
اچھا خاصہ صحرا ہے

میری آنکھوں سے دیکھو
وہ چہرہ نئی چہرہ ہے

گندم سب زہریلے ہیں
ظاہر کھیت سنہرا ہے

رونے پر ہی قید نہیں
ہنسنے پر بھی پہرا ہے

اپنی بیاضِ ہستی میں
ہر مصرع بے بحرہ ہے

دریا دریا چھان چکے
ساحل سب سے گہرا ہے

دونوں دوست ہیں برسوں سے
میں گونگا ، وہ بہرا ہے

○

مرے سورج کو ٹھنڈا کر رہا ہے
سمندر دھیرے دھیرے مر رہا ہے

جمی ہے سوچ پر قدموں کی چاپیں
نہ جانے کون پیچھا کر رہا ہے

میں اکثر بادلوں میں دیکھتا ہوں
کوئی بوڑھا عبادت کر رہا ہے

اب اُس کی ٹھوکروں میں تاج ہو گا
وہ ساری عمر ننگے سر رہا ہے

دل اپنے غم رسیدہ پیراہن میں
اُمیدوں کا کشیدہ بھر رہا ہے

مرے سینے سے گزری ریل گاڑی
جدائی کا عجب منظر رہا ہے

بڑا تاجر بنا پھرتا ہے سورج
مرے خوابوں کا سودا کر رہا ہے

ہو فرصت تو ہمارے دکھ بھی بانٹے
ذرا دیکھو خدا کیا کر رہا ہے

○

شہر کیا دیکھیں کہ ہر منظر میں جالے پڑ گئے
ایسی گرمی ہے کہ پیلے پھول کالے پڑ گئے

میں اندھیروں سے بچا لایا تھا اپنے آپ کو
میرا دکھ یہ ہے میرے پیچھے اُجالے پڑ گئے

جن زمینوں کے قبالے ہیں مرے پرکھوں کے نام
اُن زمینوں پر مرے جینے کے لالے پڑ گئے

طاق میں بیٹھا ہوا بوڑھا کبوتر رو دیا
جس میں ڈیرا تھا اُسی مسجد میں تالے پڑ گئے

کوئی وارث ہو تو آئے اور آ کر دیکھ لے
ظلِ سبحانی کی اُونچی چھت میں جالے پڑ گئے

رشتوں کی دھوپ چھاؤں سے آزاد ہو گئے
اب تو ہمیں بھی سارے سبق یاد ہو گئے

آبادیوں میں ہوتے ہیں برباد کتنے لوگ
ہم دیکھنے گئے تھے تو برباد ہو گئے

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پر بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہو گئے

لفظوں کے ہیر پھیر کا دھندہ بھی خوب ہے
جاہل ہمارے شہر میں اُستاد ہو گئے

جو منصوبوں کے پجاری پہن کے آتے ہیں
کُلاہ، طوق سے بھاری پہن کے آتے ہیں

امیرِ شہر تری طرح قیمتی پوشاک
مری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

یہی عقیق تھے شاہوں کے تاج کی زینت
جو انگلیوں میں مداری پہن کے آتے ہیں

ہمارے جسم کے داغوں پہ تبصرہ کرنے
قمیصیں لوگ ہماری پہن کے آتے ہیں

عبادتوں کا تحفظ بھی اُن کے ذمے ہے
جو مسجدوں میں سفاری پہن کے آتے ہیں

○

غزل پھیری لگا کر بیچتا ہوں
میں صرافے میں پتھر بیچتا ہوں

یہ مٹی کی چڑیوں کے بدن پر
گلابی پر لگا کر بیچتا ہوں

مجھے پروا نہیں سود و زیاں کی
میں قطروں میں سمندر بیچتا ہوں

جہاں چاروں طرف بے چہرگی ہے
وہاں آئینے لا کر بیچتا ہوں

بناتا ہے وہ کاغذ کی منڈیریں
میں مٹی کے کبوتر بیچتا ہوں

خریدے ہیں مرے بچوں نے فاقے
میں سڑکوں پر مقدر بیچتا ہوں

خموشی ہے مرے لفظوں کی گاہک
بڑے نایاب گوہر بیچتا ہوں

پرانی ہو چکی ہیں ساری خبریں
مگر عنواں بدل کر بیچتا ہوں

کتابوں کی دکاں کھولی ہے میں نے
بہت سستے میں زیور بیچتا ہوں

آنکھ میں جتنے بھی آنسو تھے ٹھکانے لگ گئے
آتے آتے اک تبسم تک زمانے لگ گئے

اب تو صحرا اور سمندر کے لیے ہیں بارشیں
کھیتیاں جتنی تھیں اُن پر کارخانے لگ گئے

آپ سے اک بات کہنی ہے بس اتنی بات تھی
مجھ کو اتنی بات کہنے میں زمانے لگ گئے

تیری پلکوں کے گھنے سائے کا موسم خوب ہے
دھوپ میں نکلا تو سر پر شامیانے لگ گئے

بند کمروں کی اُمس اپنا مقدر بن گئی
چھت پہ جب پہنچے تو بادل سر اٹھانے لگ گئے

○

تمہارے نام پر میں نے ہر آفت سر پہ رکھی تھی
نظر شعلوں پہ رکھی ، زباں پتھر پہ رکھی تھی

ہمارے خواب تو شہروں کی سڑکوں پر بھٹکتے تھے
تمہاری یاد تھی جو رات بھر بستر پہ رکھی تھی

میں اپنا عزم لے کر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پہ رکھی تھی ، قسمت گھر پہ رکھی تھی

انہیں سانسوں کے چکر نے ہمیں وہ دن دکھائے تھے
ہمارے پاؤں کی مٹی ہمارے سر پہ رکھی تھی

سحر تک تم جو آ جاتے تو منظر دیکھ سکتے تھے
دیے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

○

میرا بھی نام خاک نشیں رکھ کر بھول جائے
دنیا مجھے بھی زیرِ زمیں رکھ کر بھول جائے

اک شخص تیرے در سے حکومت طلب کرے
اک شخص تیرے در پر جبیں رکھ کر بھول جائے

وہ بھول بھول جاتا ہے ہر بات آج کل
ایسا نہ ہو کہ خود کو کہیں رکھ کر بھول جائے

میں جانتا ہوں بھولنا آساں نہیں مگر
وہ مجھ کو بھولنے پہ یقیں رکھ کر بھول جائے

اُس کا یہاں پہ کچھ بھی نہیں ہے، اُسے کہو
جو چیز ہے جہاں کی وہیں رکھ کر بھول جائے

○

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

میں جانتا تھا کہ زہریلا سانپ بن بن کر
ترا خلوص مری آستیں سے نکلے گا

اِسی گلی میں وہ بھوکا فقیر رہتا تھا
تلاش کیجیے خزانہ یہیں سے نکلے گا

بزرگ کہتے تھے اک وقت آئے گا، جس دن
جہاں پہ ڈوبے گا سورج وہیں سے نکلے گا

گزشتہ سال کے زخمو! ہرے بھرے رہنا
جلوس اب کے برس بھی یہیں سے نکلے گا

○

قطرہ قطرہ خوب اُچھالیں گنگا جی
ہم پیاسوں پر ہاتھ نہ ڈالیں گنگا جی

بستی والے سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں
ساحل پر دیوار اُٹھا لیں گنگا جی

کیسے کیسے لوگوں نے اشنان کیا
حکم ملے تو ہم بھی نہا لیں گنگا جی

ہم تو کنارے کے پانی میں ڈوبے ہیں
دیکھیں کتنی دور نکالیں گنگا جی

ساری دنیا آپ کو اَمرت کہتی ہے
پھولوں پر تیزاب نہ ڈالیں گنگا جی

O

یہ زندگی کسی گونگے کا خواب ہے بیٹا
سنبھل کے چلنا کہ رستہ خراب ہے بیٹا

ہمارا نام لکھا ہے پرانے قلعوں پر
مگر ہمارا مقدر خراب ہے بیٹا

گناہ کرنا کسی بے گناہ کی خاطر
مری نگاہ میں کارِ ثواب ہے بیٹا

اب اور تاش کے پتوں کی سیڑھیوں پہ نہ چڑھ
کہ اِس کے آگے خدا کا عذاب ہے بیٹا

ہمارے صحن کی مہندی پہ ہے نظر اُس کی
زمیندار کی نیت خراب ہے بیٹا

تو ، تو اپنے مشوروں کے زخم دے کر چھوڑ دے
مجھ کو زندہ کس طرح رہنا ہے مجھ پر چھوڑ دے

اِن ہوا کے زلزلوں کا ہے ضروری کچھ علاج
ریت پر کاغذ کی اک کشتی بنا کر چھوڑ دے

اب تو اِس شیشے کے گھر میں سانس لینا ہے محال
کم سے کم سر پھوڑنے کو ایک پتھر چھوڑ دے

دل کی دولت اِس قدر معصومیت سے اُڑ گئی
جیسے اک شہزادی ہاتھوں سے کبوتر چھوڑ دے

دل تیرے جھوٹے خطوں سے بجھ گیا اب آ بھی جا
جسم کے گوتم سے کیا اُمید کب گھر چھوڑ دے

تو، تو اپنے مشوروں کے زخم دے کر چھوڑ دے
مجھ کو زندہ کس طرح رہنا ہے مجھ پر چھوڑ دے

اِن ہوا کے زلزلوں کا ہے ضروری کچھ علاج
ریت پر کاغذ کی اک کشتی بنا کر چھوڑ دے

اب تو اِس شیشے کے گھر میں سانس لینا ہے محال
کم سے کم سر پھوڑنے کو ایک پتھر چھوڑ دے

دل کی دولت اِس قدر معصومیت سے اُڑ گئی
جیسے اک شہزادی ہاتھوں سے کبوتر چھوڑ دے

دل تیرے جھوٹے خطوں سے بجھ گیا اب آ بھی جا
جسم کے گوتم سے کیا اُمید کب گھر چھوڑ دے

لمحہ لمحہ جنگ ہے کچھ دیر مہلت چاہیے
صاحبو! اچھی غزل کہنے کو فرصت چاہیے

خودکشی کو بزدلی کہنا سمجھ کا پھیر ہے
موت سے آنکھیں ملانے میں بھی ہمت چاہیے

گالیاں لکھی گئیں اپنے خداؤں کے لیے
جس طرح بھی مل سکے لوگوں کو شہرت چاہیے

اُس کی جب مرضی ہو مجھ کو لوٹ سکتا ہے مگر
وہ مہذب ہے، اُسے میری اجازت چاہیے

شاعری، آوارگی، خوشبو، وفا، لذت، شراب
مختلف شکلوں میں شہزادے کو عورت چاہیے

○

کوئی موسم ہو ، دکھ سکھ میں گزارا کون کرتا ہے
پرندوں کی طرح سب کچھ گوارا کون کرتا ہے

سمندر کے سفر میں ساتھ چلنا ہے بہت مشکل
یہ موجیں خود بتا دیں گی ، کنارہ کون کرتا ہے

وزیروں سے سفارش کی تمنا ہم نہیں کرتے
ہمیں معلوم ہے ذرّے کو تارا کون کرتا ہے

گھروں کی راکھ پھر دیکھیں گے پہلے دیکھنا یہ ہے
گھروں کو پھونک دینے کا اشارہ کون کرتا ہے

جسے دنیا کہا جاتا ہے ، کوٹھے کی طوائف ہے
اشارہ کس کو کرتی ہے ، نظارہ کون کرتا ہے

O

کبھی دماغ، کبھی دل، کبھی نظر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو

جلا نہ لو کہیں ہم دردیوں میں اپنا وجود
گلی میں آگ لگی ہو تو اپنے گھر میں رہو

تمہیں پتا یہ چلے گھر کی راحتیں کیا ہیں
ہماری طرح اگر چار دن سفر میں رہو

ہے اب یہ حال کہ در در بھٹکتے پھرتے ہیں
غموں سے میں نے کہا تھا کہ میرے گھر میں رہو

کسی کو زخم دیے ہیں، کسی کو پھول دیے
بُری ہو، چاہے بھلی ہو، مگر خبر میں رہو

○

مجھ پر نہیں اُٹھے ہیں تو اُٹھ کر کہاں گئے
میں شہر میں نہیں تھا تو پتھر کہاں گئے

کتنے ہی لوگ پیاس کی شدت سے مر چکے
میں سوچتا رہا کہ سمندر کہاں گئے

میں خود ہی میزبان ہوں مہمان بھی ہوں خود
سب لوگ مجھ کو گھر پہ بلا کر کہاں گئے

یہ کیسی روشنی ہے کہ احساس بجھ گیا
ہر آنکھ پوچھتی ہے کہ منظر کہاں گئے

پچھلے دنوں کی آندھی میں گنبد تو گر چکا
اللہ جانے سارے کبوتر کہاں گئے

○

ہر نئی شے کو پرانی کر دوں
آگ مل جائے تو پانی کر دوں

دن کے کاموں سے جو فرصت مل جائے
تیری ہر رات سہانی کر دوں

قید آنکھوں میں ہیں آنسو ورنہ
ہر طرف پانی ہی پانی کر دوں

میں سبک لفظ و معنی کا امیں
سنگ بھی آئے تو پانی کر دوں

کام جو کر نہ سکیں تحریریں
مجھ سے کہیے تو زبانی کر دوں

وضع داری ہے لہو میں ورنہ
میں ابھی ختم کہانی کر دوں

آ ، قصیدہ کوئی لکھوں تیرا
لا ، تجھے یوسفِ ثانی کر دوں

چمکتے لفظ ستاروں سے چھین لائے ہیں
ہم آسماں سے غزل کی زمین لائے ہیں

وہ اور ہوں گے جو خنجر چھپا کے لاتے ہیں
ہم اپنے ساتھ پھٹی آستین لائے ہیں

ہماری بات کی گہرائی خاک سمجھیں گے
جو پربتوں کے لیے خوردبین لائے ہیں

ہنسو! نہ ہم پہ کہ ہر بدنصیب بنجارے
سروں پہ رکھ کے وطن کی زمین لائے ہیں

مرے قبیلے کے بچوں کے کھیل بھی ہیں عجیب
کسی سپاہی کی تلوار چھین لائے ہیں

اذاں سنتا تھا، لیکن نیند کے دَل دَل میں رہتا تھا
میں پہلے بھی مسلماں تھا مگر بوتل میں رہتا تھا

جسے دے دی دعا وہ قیمتی مخمل میں رہتا تھا
مگر وہ خود ہمیشہ اک پھٹے کمبل میں رہتا تھا

مجھے ماضی کی کالی ناگنیں ڈسنے کو آتی تھیں
میں پرکھوں کی حویلی چھوڑ کے ہوٹل میں رہتا تھا

وہ دوہری شہریت رکھتا تھا کوئی اُس سے کیا ملتا
کبھی دلّی میں رہتا تھا، کبھی چمبل میں رہتا تھا

دھوئیں کے رنگ سے شہروں کی دیواروں پہ لکھا ہے
بہت محفوظ تھا انسان جب جنگل میں رہتا تھا

○

جب کبھی پھولوں نے خوشبو کی تجارت کی ہے
پتی پتی نے ہواؤں سے شکایت کی ہے

یوں لگا جیسے کوئی عطر فضا میں گھل گیا
جب کسی بچے نے قرآں کی تلاوت کی ہے

جا نمازوں کی طرح نور میں اُجلا سحر
رات بھر جیسے فرشتوں نے عبادت کی ہے

سر اُٹھائے تھیں بہت سرخ ہوائیں پھر بھی
ہم نے پلکوں کے چراغوں کی حفاظت کی ہے

مجھے طوفانِ حوادث سے ڈرانے والو!
حادثوں نے تو مرے ہاتھ پہ بیعت کی ہے

آج اِک دانۂ گندم کے بھی حق دار نہیں
ہم نے صدیوں اِنہیں کھیتوں پہ حکومت کی ہے

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کے جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

○

مسجد ، خالی خالی ہے
بستی میں قوالی ہے

ہم جیسوں سے خالی ہے
دنیا قسمت والی ہے

نور جہاں ہے پہلو میں
دل میں سبزی والی ہے

ماضی ہو یا مستقبل
اپنی وہی بے حالی ہے

دریا پھر بھی دریا ہے
جگ نے پیاس بجھالی ہے

دنیا پہلے پتھر تھی
ہم نے موم بنا لی ہے

سایہ سایہ ڈھونڈ اُسے
جس نے دھوپ نکالی ہے

کچھ تبدیلی ہو یارو!
برسوں سے خوش حالی ہے

○

بن کے اک دن ہم ضرورت مند گنتے رہ گئے
کتنے دروازے ہوئے ہیں بند گنتے رہ گئے

کوڑیوں کے مول لے لی میں نے ساری کائنات
سب مری پوشاک کے پیوند گنتے رہ گئے

وہ اکیلا تھا، نہتا تھا، جو بازی لے گیا
اور ہم اپنے جواں فرزند گنتے رہ گئے

اتنی دولت اک بھکاری کے یہاں نکلی کہ بس
شہر میں جتنے تھے دولت مند گنتے رہ گئے

شاخ پر جتنے تھے پھل کوئی چرا کر لے گیا
اور ہم اخلاق کے پابند گنتے رہ گئے

○

وہ اک اک بات پہ رونے لگا تھا
سمندر آبرو کھونے لگا تھا

لگے رہتے تھے سب دروازے پھر بھی
میں آنکھیں کھول کر سونے لگا تھا

چُراتا ہوں اب آنکھیں آئینوں سے
خدا کا سامنا ہونے لگا تھا

وہ اب آئینے دھوتا پھر رہا ہے
اُسے چہرے پہ شک ہونے لگا تھا

مجھے اب دیکھ کر ہنستی ہے دنیا
میں سب کے سامنے رونے لگا تھا

O

سمندر پار ہوتی جا رہی ہے
دعا ، پتوار ہوتی جا رہی ہے

دریچے اب کھلے ملنے لگے ہیں
فضا ہموار ہوتی جا رہی ہے

کئی دن سے مرے اندر کی مسجد
خدا بے زار ہوتی جا رہی ہے

مسائل ، جنگ ، خوشبو ، رنگ ، موسم
غزل اخبار ہوتی جا رہی ہے

بہت کانوں بھری دنیا ہے لیکن
گلے کا ہار ہوتی جا رہی ہے

کٹی جاتی ہیں سانسوں کی پتنگیں
ہوا تلوار ہوتی جا رہی ہے

کوئی گنبد ہے دروازے کے پیچھے
صدا بے کار ہوتی جا رہی ہے

گلے کچھ دوست آ کر مل رہے ہیں
چھری پر دھار ہوتی جا رہی ہے

سفر سفر تری یادوں کا نور جائے گا
ہمارے ساتھ یہ سورج ضرور جائے گا

دلوں کا رشتہ ہی سب سے بڑی صداقت ہے
نہ جانے کب یہ دماغی فتور جائے گا

بکھر چکا ہوں میں اِملی کی پتیوں کی طرح
اب اور لے کے کہاں تک غرور جائے گا

مری دعاؤ! ذرا آس پاس ہی رہنا
وہ اِس سفر میں بہت دور دور جائے گا

یہ مشورہ ہے کہ بیساکھیاں اُدھار نہ لے
اُڑنچھیوں سے کوئی کتنی دور جائے گا

O

اِسے سامانِ سفر جان یہ جگنو رکھ لے
راہ میں تیرگی ہو گی مرے آنسو رکھ لے

تو جو چاہے تو ترا جھوٹ بھی بِک سکتا ہے
شرط اتنی ہے کہ سونے کی ترازو رکھ لے

وہ کوئی جسم نہیں ہے کہ اُسے چھو بھی سکیں
ہاں، اگر نام ہی رکھنا ہے تو خوشبو رکھ لے

تجھ کو اَن دیکھی بلندی میں سفر کرنا ہے
احتیاطاً مری ہمت ، مرے بازو رکھ لے

مری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اُٹھے
مرے بھائی! مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

○

ابھی تو صرف پرندے شمار کرنا ہے
یہ پھر بتائیں گے کس کا شکار کرنا ہے

بہت غرور ہے تجھ کو اے سر پھرے طوفاں
مجھے بھی ضد ہے کہ دریا کو پار کرنا ہے

ہم اپنے شہروں میں محفوظ بھی ہیں، خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

تجھے قبیلے کے قانون توڑنے ہوں گے
مجھے تو صرف ترا انتظار کرنا ہے

ہمارا شوق ہے دار و رسن کی پیمائش
تمہارا کام کبوتر شکار کرنا ہے

زندگی کو زخم کی لذت سے مت محروم کر
راستے کے پتھروں سے خیریت معلوم کر

ٹوٹ کر بکھری ہوئی تلوار کے ٹکڑے سمیٹ
اور اپنے ہار جانے کا سبب معلوم کر

جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو غزل کا نام دے
رات بھر کی کروٹوں کا ذائقہ منظوم کر

شام تک لوٹ آؤں گا ہاتھوں کا خالی پن لیے
آج پھر نکلا ہوں میں گھر سے ہتھیلی چوم کر

مت سکھا لہجے کو اپنی برچھیوں کے پینترے
زندہ رہنا ہے تو لہجے کو ذرا معصوم کر

○

لوگ ہر موڑ پہ رُک رُک کے سنبھلتے کیوں ہیں
اتنا ڈرتے ہیں تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہیں

مے کدہ ظرف کے معیار کا پیمانہ ہے
خالی شیشوں کی طرح لوگ اُچھلتے کیوں ہیں

موڑ ہوتا ہے جوانی کا سنبھلنے کے لیے
اور سب لوگ یہیں آ کے پھسلتے کیوں ہیں

نیند سے میرا تعلق ہی نہیں برسوں سے
خواب آ، آ کے مری چھت پہ ٹہلتے کیوں ہیں

میں نہ جگنو ہوں، دیا ہوں نہ کوئی تارا ہوں
روشنی والے مرے نام سے جلتے کیوں ہیں

○

سلگتے حرف کا نشہ اُتارنے والے
غزل اُتار ، صحیفہ اُتارنے والے

یہ بھول مت کہ ابھی سر پہ آسمان بھی ہے
کسی کے سر کا دوپٹا اُتارنے والے

وہ آج چلنے لگے پائنچے اُٹھائے ہوئے
کبھی چڑھا ہوا دریا اُتارنے والے

بٹھا رہے ہیں دنیا کو اپنی پلکوں پر
مری نگاہ سے دنیا اُتارنے والے

اکیلے پن کے سیہ ناگ ڈس رہے ہیں مجھے
مرے پرندوں کا جوڑا اُتارنے والے

مذاق بنتے ہیں ان دیکھے حادثوں کے لیے
ذرا سی بات پہ چہرہ اُتارنے والے

ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں آج
ہماری جان کا صدقہ اُتارنے والے

سلگتی پیاس کا کچھ حل ضرور نکلے گا
ہمارے نام کا بادل ضرور نکلے گا

عدالتیں نہ سہی ، جنگ کی زمیں پہ سہی
میں مسئلہ ہوں مرا حل ضرور نکلے گا

ہیں مُردہ خور پرندے چھتوں پہ بیٹھے ہوئے
یہیں کہیں کوئی مقتل ضرور نکلے گا

کوئی بھی دَور ہو ، لے کر جہاد کی مشعل
مری طرح کوئی پاگل ضرور نکلے گا

ہرے بھرے کئی شہروں کا تجربہ ہے مجھے
کہیں بھی جایئے جنگل ضرور نکلے گا

میں جب چلوں تو یہ دولت بھی ساتھ رکھ دینا
مرے بزرگ! مرے سر پہ ہاتھ رکھ دینا

ڈھلے گا دن تو سلگنے لگے گا دل میرا
مجھے بھی گھر کے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

یہ آنے والے زمانوں کے کام آئیں گے
کہیں چھپا کے مرے تجربات رکھ دینا

اندھیری رات کے گمراہ جگنوؤں کے لیے
اُداس دھوپ کی ٹہنی پہ رات رکھ دینا

میں ایک بچہ ہوں اگر سن سکو تو سنتے رہو
غلط کہوں تو مرے منہ پہ ہاتھ رکھ دینا

تمہیں کہو ، کہ ٹھکانہ مرا کہاں ہے میاں
زمیں سے بھاگ بھی جاؤں تو آسماں ہے میاں

میں تجھ سے جھوٹ بھی بولوں تو چھپ نہیں سکتا
تمام شہر یہاں میرا رازداں ہے میاں

مجھے خبر نہیں مندر جلے ہیں یا مسجد
مری نگاہ کے آگے تو بس دُھواں ہے میاں

میں سب کو رام سمجھ لوں تو یہ بھی ٹھیک نہیں
یہاں ہر ایک کے کاندھے پہ اک کماں ہے میاں

ابھی تو کوئی ترقی نہ کر سکے ہم لوگ
وہی کرائے کا ٹوٹا ہوا مکاں ہے میاں

○

وہ ایک تیر ہے جس کا شکار میں بھی ہوں
میں ایک حرف سہی دل کے پار میں بھی ہوں

وہ سامنے رہا دریا کا دوسرا ساحل
اگر جہاز نہ ڈوبا تو پار میں بھی ہوں

کسے خبر ہے کہ سوئے سمندر کی طرح
بہت دنوں سے بہت بے قرار میں بھی ہوں

یہاں تو موت کا سیلاب آتا رہتا ہے
بہت بچا تھا ، مگر اب کے بار میں بھی ہوں

اُسے تو خیر بہت کچھ کہا سنا میں نے
وہ خوش نہیں ہے مگر بے قرار میں بھی ہوں

ہے میرے نام پہ کیوں دوہری ہجرتوں کا عذاب
مری زمین! ترا جاں نثار میں بھی ہوں

نہ جانے کس کے مقدر میں وہ لکھا ہو گا
مگر یہ سچ ہے کہ اُمیدوار میں بھی ہوں

مرے عزیز! مری خشک ٹہنوں پہ نہ جا
مرے قریب تو آ ، سایہ دار میں بھی ہوں

○

کہاں گزار دیں سانسیں جواب مانگے گا
وہ جب بھی ہم سے ملے گا حساب مانگے گا

دیا نہ چھین مرے ہاتھ سے کہ دل میرا
مچل گیا تو ابھی آفتاب مانگے گا

جو ہنس رہا ہے مرے شعروں پہ وہی اک دن
کتب فروش سے میری کتاب مانگے گا

شکست کھا ہی گیا مرا حاتمانہ مزاج
کسے خبر تھی کہ وہ میرے خواب مانگے گا

شریف لوگ تو مسجد میں جا کے بیٹھ گئے
وہ جانتے تھے کہ راحت شراب مانگے گا

○

میں لاکھ کہہ دوں کہ آکاش ہوں، زمیں ہوں میں
مگر اُسے خبر ہے کہ کچھ نہیں ہوں میں

عجیب لوگ ہیں میری تلاش میں مجھ کو
وہاں پہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں نہیں ہوں میں

میں آئینوں سے تو مایوس لوٹ آیا تھا
مگر کسی نے بتایا بہت حسیں ہوں میں

وہ ذرّے ذرّے میں موجود ہے مگر میں بھی
کہیں کہیں ہوں، کہاں ہوں؟ کہیں نہیں ہوں میں

وہ اِک کتاب جو منسوب تیرے نام سے ہے
اُسی کتاب کے اندر کہیں کہیں ہوں میں

ستارو! آؤ مری راہ میں بکھر جاؤ
یہ میرا حکم ہے، حالاں کہ کچھ نہیں ہوں میں

یہیں حسینؑ بھی گزرے، یہیں یزید بھی تھا
ہزار رنگ میں ڈوبی ہوئی زمیں ہوں میں

یہ بوڑھی قبریں تمھیں کچھ نہیں بتائیں گی
مجھے تلاش کرو، دوستو! یہیں ہوں میں

○

راہ میں خطرے بھی ہیں لیکن ٹھہرتا کون ہے
موت، کل آتی ہے، آج آ جائے ڈرتا کون ہے

سب ہی اپنی تیز گامی کے نشے میں چُور ہیں
لاکھ آوازیں لگا لیجیے ٹھہرتا کون ہے

ہیں پرندوں کے لیے شاداب پیڑوں کے ہجوم
اب مری ٹوٹی ہوئی چھت پہ اُترتا کون ہے

تیرے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں، مگر
فیصلہ میدان میں ہو گا کہ مرتا کون ہے

سب نے مَل رکھا ہے چہروں پر تعصب کا غبار
آئینہ ہم بن بھی جائیں تو سنورتا کون ہے

○

وہ سامنے پہاڑ ہے حسرت نکال لے
تیشہ نہیں تو پھول کا ریشہ نکال لے

ہونٹوں پہ اپنے پیاس کا دوزخ کھنگال لے
یا ایڑھیاں رگڑ کوئی چشمہ نکال لے

بھائی سمجھ رہا ہے ، تو آ جا گلے لگیں
دشمن سمجھ رہا ہے تو حسرت نکال لے

پھر شوق سے بڑھانا ادھر دوستی کا ہاتھ
پہلے تو مجھ کو اچھی طرح دیکھ بھال لے

ایسے تو ختم ہو نہ سکے گا مقابلہ
اب مشورہ یہی ہے کہ سکہ اُچھال لے

یہ لغزشیں تو میری وراثت میں آئی ہیں
اب تیرا کام ہے کہ گروں تو سنبھال لے

پھر رات لے کے آئی ہے تنہائی کا فسوں
تازہ غزل کے واسطے مصرعہ نکال لے

آنکھوں کے لفظ، زلف کا جھرنا، لبوں کے چاند
سب پھول توڑ توڑ کے غزلوں میں ڈال لے

یارو! معاف میرؔ کا میں معتقد نہیں
ایسی بھی کیا غزل جو کلیجہ نکال لے

یوں صدا دیتے ہوئے تیرے خیال آتے ہیں
جیسے کعبے کی کھلی چھت پہ بلالؓ آتے ہیں

روز ہم اشکوں سے دھو آتے ہیں دیوارِ حرم
پگڑیاں روز فرشتوں کی اُچھال آتے ہیں

ہاتھ ابھی پیچھے بندھے رہتے ہیں، چپ رہتے ہیں
دیکھنا یہ ہے تجھے کتنے کمال آتے ہیں

چاند سورج مری چوکھٹ پہ کئی صدیوں سے
روز لکھے ہوئے چہرے پہ سوال آتے ہیں

بے حسی ، مردہ دلی ، رقص ، شرابیں ، نغمے
بس اِسی راہ سے قوموں پہ زوال آتے ہیں

○

دوست ہے تو مرا کہا بھی مان
مجھ سے شکوہ بھی کر، بُرا بھی مان

دل کو سب سے بڑا حریف سمجھ
اور اِسی سنگ کو خدا بھی مان

میں کبھی سچ بھی بول دیتا ہوں
گاہے گاہے مرِا کہا بھی مان

یاد کر دیوتاؤں کے اوتار
ہم فقیروں کا سلسلہ بھی مان

کاغذوں کی خموشیاں بھی پڑھ
ایک اک حرف کو صدا بھی مان

آزمائش میں کیا بگڑتا ہے
فرض کر ، اور مجھے بھلا بھی مان

میری باتوں سے کچھ سبق بھی لے
میری باتوں کا کچھ بُرا بھی مان

غم سے بچنے کی سوچ کچھ تدبیر
اور اِسی غم کو آسرا بھی مان

○

مرے خلوص کی گہرائی سے نہیں ملتے
یہ جھوٹے لوگ ہیں سچائی سے نہیں ملتے

وہ سب سے ملتے ہوئے ہم سے ملنے آتا ہے
ہم اِس طرح کسی ہرجائی سے نہیں ملتے

پرانے زخم ہیں کافی ، شمار کرنے کو
سو جان بوجھ کر پُروائی سے نہیں ملتے

ہیں ساتھ ساتھ مگر فرق ہے مزاجوں کا
مرے قدم مری پرچھائی سے نہیں ملتے

محبتوں کا سبق دے رہے ہیں دنیا کو
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتے

یہ خاک زادے جو رہتے ہیں بے زبان پڑے
اشارہ کر دیں تو سورج، زمیں پہ آن پڑے

سکوتِ زیست کو آمادۂ بغاوت کر
لہو اُچھال کہ کچھ زندگی میں جان پڑے

ہمارے شہر کی بینائیوں پہ روتے ہیں
تمام شہر کے منظر لہولہان پڑے

اُٹھے ہیں ہاتھ مرے حرمتِ زمیں کے لیے
مزا جب آئے کہ اب پاؤں آسمان پڑے

کسی مکین کی آمد کے انتظار میں ہیں
مرے محلے میں خالی کئی مکان پڑے

○

اب اپنے لہجے میں نرمی بہت زیادہ ہے
نئے برس میں نئی جنگ کا ارادہ ہے

میں اپنی لاش لیے پھر رہا ہوں کاندھے پر
یہاں زمین کی قیمت بہت زیادہ ہے

خبر نہیں کہ ہوا کس طرح اُڑا لے جائے
ہماری نسل بکھرتا ہوا بُرادہ ہے

محل میں خاص مصاحب بھی جا نہیں سکتے
وہاں حرم کی کنیزیں ہیں ، شاہ زادہ ہے

تمہارا ترکشِ الزام بھی نہیں خالی
ہمارا سینۂ اخلاق بھی کشادہ ہے

گھر سے یہ سوچ کے نکلا ہوں کہ مر جانا ہے
اب کوئی راہ دکھا دے کہ کدھر جانا ہے

جسم سے ساتھ نبھانے کی مت اُمید رکھو
اس مسافر کو تو رستے میں ٹھہر جانا ہے

موت لمحے کی صدا ، زندگی عمروں کی پکار
میں یہی سوچ کے زندہ ہوں کہ مر جانا ہے

نشہ ایسا تھا کہ مے خانے کو دنیا سمجھا
ہوش آیا ، تو خیال آیا کہ گھر جانا ہے

مرے جذبے کی بڑی قدر ہے لوگوں میں مگر
میرے جذبے کو مرے ساتھ ہی مر جانا ہے

○

کہاں وہ خواب محل تاج داریوں والے
کہاں یہ بیلچوں والے ، تگاریوں والے

کبھی مچان سے نیچے اُتر کے بات کرو
بہت پرانے ہیں قصے شکاریوں والے

مجھے خبر ہے کہ میں سلطنت کا مالک ہوں
مگر بدن پہ ہیں کپڑے بھکاریوں والے

غریب قصبوں میں اکثر دکھائی دیتے ہیں
نئے شوالے ، پرانے پجاریوں والے

زمیں پہ رینگتے پھرنے کی ہم کو عادت ہے
ہمارے ساتھ نہ آئیں سواریوں والے

ادب کہاں کا کہ ہر رات دیکھتا ہوں میں
مشاعرے میں تماشے مداریوں والے

مری بہار مرے گھر کے پھول دان میں ہے
کھلے ہیں پھول ہری پیلی دھاریوں والے

○

آنسو ، آنسو ، سازش ہوتی رہتی ہے
ہر موسم میں بارش ہوتی رہتی ہے

ہم لوگوں سے جھک کر ملتے رہتے ہیں
قامت کی پیمائش ہوتی رہتی ہے

کائی جمی رہتی ہے روحوں پر لیکن
جسموں کی آرائش ہوتی رہتی ہے

اُجلے گنبد ، کالے فیتے باندھے ہیں
جانے کیا کیا سازش ہوتی رہتی ہے

آتی جاتی چڑیاں روشن دانوں میں
گھر آنگن کی خواہش ہوتی رہتی ہے

گھر کے باہر سورج آگ اُگلتا ہے
گھر کے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

مجھ سے دل کا حال کوئی کب پوچھتا ہے
غزلوں کی فرمائش ہوتی رہتی ہے

ہوں لاکھ ظلم مگر بد دعا نہیں دیں گے
زمیں ماں ہے، زمیں کو دغا نہیں دیں گے

ہمیں تو صرف جگانا ہے سونے والوں کو
جو در کھلا ہے وہاں ہم صدا نہیں دیں گے

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو! ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے

یہاں کہاں ترا سجادہ آ کے خاک پہ بیٹھ
کہ ہم فقیر تجھے بوریا نہیں دیں گے

شراب پی کے بڑے تجربے ہوئے ہیں ہمیں
شریف لوگوں کو ہم مشورہ نہیں دیں گے

ہر قدم پر کام اپنی جاں نثاری آئے گی
دوستوں کے بعد پھر دشمن کی باری آئے گی

دیکھنا یہ ہے کہ اِس بازار کا مالک ہے کون
پوچھنا یہ ہے کہ کیا قیامت ہماری آئے گی

راستوں پر خوف طاری ہے مناظر دھند ہیں
آج اِس بستی میں راجا کی سواری آئے گی

تیشہ بردارو! سمندر بھی ہے اِس پربت کے بعد
دن تو جوں توں کٹ چکا ہے رات بھاری آئے گی

آج تیری زد پہ ہوں بچ کر نہ جانے دے مجھے
ورنہ تیرے بعد پھر میری ہی باری آئے گی

○

مرے احباب کو جس وقت بھی فرصت ہو گی
اور تو کچھ نہیں ہو گا ، مری غیبت ہو گی

ہے ترے نام سے اِس شام کا یہ پہلا جام
اِن شاء اللہ اِسی جام میں ، برکت ہو گی

ابھی رنگوں کی زباں گنگ پڑی ہے لیکن
جب یہ تصویر بنے گی تو قیامت ہو گی

اب کے بارش میں نہانے کا مزہ آئے گا
بے لباسی کی طرح گھر کی کھلی چھت ہو گی

اُس سے ملنا ہے تو وہ شام ڈھلے ملتا ہے
دھوپ میں گھر سے نکلنا تو حماقت ہو گی

یہ چراغ اپنے ہی طاقوں پہ سجا لے اے دوست
روشنی کی ترے گھر میں بھی ضرورت ہو گی

شام جب واپسی ہو گی تو ہمیشہ کی طرح
گھر کی دہلیز کے پتھر سے ندامت ہو گی

ماں کے قدموں کے نشاں ہیں کہ دیے روشن ہیں
غور سے دیکھ یہیں پر کہیں جنت ہو گی

○

کہیں لباس کی صورت اُتار دے مجھ کو
عذاب روح ، کوئی اختیار دے مجھ کو

میں گرد گرد ہوں خود کو نہ دیکھ پاؤں گا
تو آئینہ ہے تو آ کر سنوار دے مجھ کو

الف سے یے تلک ایک ایک حرف دشمن ہے
وہ ہم سخن ہی نہیں ہے جو پیار دے مجھ کو

میں تجھ کو روشنیاں دے کے جاؤں گا اک دن
اندھیری رات سمجھ کر گزار دے مجھ کو

وہ مجھ سے کہہ کے گیا ہے کہ لوٹ آؤں گا
مرے عظیم خدا ، اعتبار دے مجھ کو

صلح کرتے ہیں کہ جینے کا ہنر جانتے ہیں
ورنہ ہم جنگ کے میدان کو گھر جانتے ہیں

یہ الگ بات کہ پستی میں پڑے ہیں ورنہ
چاند تاروں کو تو ہم راہ گزر جانتے ہیں

کوئی آنگن، دریچہ ہے، نہ گل دان، نہ پھول
لوگ دیواریں اُٹھا لینے کو گھر جانتے ہیں

پھول کی شاخ پہ لکھ بھیجو کہ اے دشمنِ امن
ہم بھی تلوار چلانے کا ہنر جانتے ہیں

میرے اللہ ، مری توبہ کو قائم رکھنا
کچھ شرابی ہیں جو، اَب بھی مرا گھر جانتے ہیں

○

چاند کے ماتھے پہ سورج کا نظارہ پڑھ لیا
میرؔ کو ہم نے سویرے تک دوبارہ پڑھ لیا

اپنی کاغذ کی حویلی بھیگنے سے بچ گئی
عقل مندی کی کہ موسم کا اشارہ پڑھ لیا

موجیں لکھتی جا رہی تھیں بادبانوں پر نصیب
میں نے گھبراہٹ میں طوفاں کو کنارہ پڑھ لیا

سو رہی تھی اُجلے کپڑے پہنے کالی آتما
کم سمجھ لوگوں نے ذرّے کو ستارہ پڑھ لیا

مذہبی لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا آساں نہیں
احتیاطاً ہم نے بھی پہلا سپارہ پڑھ لیا

○

شام نے جب پلکوں پہ آتش دان لیا
کچھ یادوں نے چٹکی میں لوبان لیا

دروازوں نے اپنی آنکھیں نم کر لیں
دیواروں نے اپنا سینہ تان لیا

پیاس تو اپنی سات سمندر جیسی تھی
ناحق ہم نے بارش کا احسان لیا

میں نے تلوؤں سے باندھی تھی چھاؤں مگر
شاید مجھ کو سورج نے پہچان لیا

کتنے سکھ سے دھرتی اوڑھ کے سوئے ہیں
ہم نے اپنی ماں کا کہنا مان لیا

○

جا کے یہ کہہ دے کوئی شعلوں سے، چنگاری سے
پھول اِس بار کھلے ہیں، بڑی تیاری سے

اپنی ہر سانس کو نیلام کیا ہے میں نے
لوگ آسان ہوئے ہیں بڑی دشواری سے

ذہن میں جب بھی ترے خط کی عبارت چمکی
ایک خوشبو سی نکلنے لگی الماری سے

شاہ زادے سے ملاقات تو ناممکن ہے
چلیے مِل آتے ہیں چل کر کسی درباری سے

بادشاہوں سے بھی پھینکے ہوئے سکّے نہ لیے
ہم نے خیرات بھی مانگی ہے تو خودداری سے

سفر کی حد ہے وہاں تک کہ کچھ نشان رہے
چلے چلو کہ جہاں تک یہ آسمان رہے

یہ کیا کہ آگے بڑھے اور آ گئی منزل
مزا تو جب ہے کہ پیروں میں کچھ تکان رہے

مجھے زمین کی گہرائیوں نے داب لیا
میں چاہتا تھا مرے سر پہ آسمان رہے

اب اپنے بیچ مراسم نہیں، عداوت ہے
مگر یہ بات ہمارے ہی درمیان رہے

وہ اک سوال ہے پھر اُس کا سامنا ہو گا
دعا کرو کہ سلامت مری زبان رہے

○

بزرگ مٹی کی عظمت کے اعتراف میں ہے
یہ مقبرہ ہے مگر ریشمی غلاف میں ہے

نمازیوں کے تقدس پہ طنز کرتا تھا
وہ بدمعاش کئی دن سے اعتکاف میں ہے

رفاقتوں کے حوالے سے ذکر آتا ہے
بڑا خلوص ترے میرے اختلاف میں ہے

سویرے تک تو مجھے برف کر کے رکھ دے گا
اکیلے پن کا جو موسم مرے لحاف میں ہے

ہیں خوشبوؤں کے تعاقب میں رینگتے کچھوے
مگر وہ مشک ابھی تک ہرن کی ناف میں ہے

○

خوابوں میں جو بھی ہے وہ دنیا حسین ہے
لیکن نصیب میں وہی دو گز زمین ہے

میں قطرہ قطرہ مرتا رہا ہوں تمام عمر
جو زہر پی سکے وہ مرا جانشین ہے

روٹی کی سختیوں نے ہمیں سخت کر دیا
سنتے ہیں اب بھی ڈھاکے کی ململ مہین ہے

ایمان اِس کو کہتے ہیں اے اہلِ بندگی
اک اجنبی کی بات پہ سب کو یقین ہے

ہے آسمان سے بھی بلند اِس کا مرتبہ
حالاں کہ اپنے پاؤں کے نیچے زمین ہے

○

سسکتی رت کو مہکتا گلاب کر دوں گا
میں اِس بہار میں سب کا حساب کر دوں گا

میں انتظار میں ہوں تو کوئی سوال تو کر
یقین رکھ ، میں تجھے لاجواب کر دوں گا

ہزار پردوں میں خود کو چھپا کے بیٹھ مگر
تجھے کبھی نہ کبھی بے نقاب کر دوں گا

مجھے بھروسہ ہے اپنے لہو کے قطروں پر
میں نیزے نیزے کو شاخِ گلاب کر دوں گا

مجھے یقین کہ محفل کی روشنی ہوں میں
اُسے یہ خوف کہ محفل خراب کر دوں گا

مجھے گلاس کے اندر ہی قید رکھ ورنہ
میں سارے شہر کا پانی شراب کر دوں گا

مہاجنوں سے کہو تھوڑا انتظار کریں
شراب خانے سے آ کر حساب کر دوں گا

شہر کے بکھرے ہوئے منظر اُٹھا لے جائیں گے
پھول چننے والے آ کر سر اُٹھا لے جائیں گے

اک نئی مسجد بنانا چاہتے ہیں شہر میں
تیرے کوچے کا کوئی پتھر اُٹھا لے جائیں گے

ہم فقیروں کے لیے تو ساری دنیا ایک ہے
ہم جہاں جائیں گے اپنا گھر اُٹھا لے جائیں گے

مسجدوں کی سیڑھیوں پر بیٹھنے والے فقیر
کیا خبر تھی ایک دن منبر اُٹھا لے جائیں گے

رنگ محلوں کے دریچے کھولیے عالم پناہ!
ورنہ شہزادی کو جادوگر اُٹھا لے جائیں گے

سلگتے چیختے موسم کی واپسی ہو گی
نئی رُتوں میں نئے غم کی واپسی ہو گی

جہاں کڑھے ہوئے رومال ہم نے بھیجے ہیں
وہیں سے جنگ کے پرچم کی واپسی ہو گی

کسی کنیز کی قسمت چمک بھی سکتی ہے
سویرے! صاحبِ عالم کی واپسی ہو گی

جہاں سے آگ اُگلتی تھی رات کی دیوی
اُسی دیار سے شبنم کی واپسی ہو گی

ہمیں بہار سے دل چسپیاں نہیں لیکن
خوشی یہ ہے کہ ترے غم کی واپسی ہو گی

○

ناموافق ، مرے اندر کی فضا کیسی ہے
ٹوٹ جانے کی ، بکھرنے کی صدا کیسی ہے

گل کھلانے کو ہے موسم کوئی تازہ اِس بار
بادِ صرصر کی طرح بادِ صبا کیسی ہے

کچھ لکیریں سی ہواؤں پہ بنا دیں اُس نے
میں نے پوچھا تھا کہ تصویرِ خدا کیسی ہے

دل کا آئینہ یہیں گھر میں چھپا کر نکلو!
لوگ تو صرف یہ دیکھیں گے قبا کیسی ہے

یہ کہاں لے کے چلے آئے ہو پلکوں کے چراغ
تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہوا کیسی ہے

وہی دُکھ سکھ اُسی منظر کی طرح لگتا ہے
مے کدے میں بھی مجھے گھر کی طرح لگتا ہے

تو کہاں گم ہے ترے ریشمی آنچل کی قسم
آنسو اب آنکھ میں کنکر کی طرح لگتا ہے

یاد ہیں تجھ سے بچھڑنے کی وہ ٹھنڈی راتیں
اب تو ہر رُت میں دسمبر کی طرح لگتا ہے

کبھی دل بن کے جو سینے سے لگا کرتا تھا
اب وہی پیٹھ میں خنجر کی طرح لگتا تھا

نیزہ بردار ذرا دیکھ مرے کاندھے پر
جانے کیا ہے جو مجھے سر کی طرح لگتا ہے

جس نے دیکھا نہ ہو کچھ گاؤں کے پنگھٹ کے سوا
اُسے دریا بھی سمندر کی طرح لگتا ہے

○

جہالتوں کے اندھیرے مٹا کے لوٹ آیا
میں، آج ساری کتابیں جلا کے لوٹ آیا

یہ سوچ کر کہ وہ تنہائی ساتھ لائے گا
میں چھت پہ بیٹھے پرندے اُڑا کے لوٹ آیا

وہ اب بھی ریل میں بیٹھی سسک رہی ہو گی
میں اپنا ہاتھ ہوا میں ہلا کے لوٹ آیا

خبر ملی ہے کہ سونا نکل رہا ہے وہاں
میں جس زمین پہ ٹھوکر لگا کے لوٹ آیا

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اُس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

○

مسجدوں کے صحن تک جانا بہت دشوار تھا
دَیر سے نکلا تو میرے راستے میں دار تھا

دیکھتے ہی دیکھتے شہروں کی رونق بن گیا
کل یہی چہرہ ہمارے آئینوں پر بار تھا

اپنی قسمت میں لکھی تھی دھوپ کی ناراضگی
سایۂ دیوار تھا لیکن پسِ دیوار تھا

سب کے دُکھ سکھ اُس کے چہرے پر لکھے پائے گئے
آدمی کیا تھا ہمارے شہر کا اخبار تھا

اب محلے بھر کے دروازوں پہ دستک ہے نصیب
اک زمانہ تھا کہ جب میں بھی بہت خوددار تھا

○

جنگ ہے تو جنگ کا منظر بھی ہونا چاہیے
صرف نیزے ہاتھ میں ہیں، سر بھی ہونا چاہیے

ہے دُھواں چاروں طرف بینائی لے کر کیا کروں
صرف آنکھوں ہی نہیں منظر بھی ہونا چاہیے

لے کے اک مشتِ زمیں اُڑتے ہو لیکن سوچ لو
آسماں کے ڈھانپنے کو پر بھی ہونا چاہیے

مسئلے کچھ اور ہیں بے چہرہ لوگوں کے لیے
آئینے کافی نہیں پتھر بھی ہونا چاہیے

طعنۂ آوارگی مجھ کو نہ دو ، قسمت کو دو
گھر تو جا سکتا ہوں لیکن گھر بھی ہونا چاہیے

○

فیصلے لمحات کے نسلوں پہ بھاری ہو گئے
باپ حاکم تھا مگر بیٹے بھکاری ہو گئے

دیویاں پہنچی تھیں اپنے بال بکھرائے ہوئے
دیوتا مندر سے نکلے اور پجاری ہو گئے

روشنی کی جنگ میں تاریکیاں پیدا ہوئیں
چاند پاگل ہو گیا، تارے بھکاری ہو گئے

رکھ دیے جائیں گے نیزے، لفظ اور ہونٹوں کے بیچ
ظلِ سبحانی کے احکامات جاری ہو گئے

نرم و نازک، ہلکے پھلکے روئی جیسے خواب تھے
آنسوؤں میں بھیگنے کے بعد بھاری ہو گئے

○

بیمار کو مرض کی دوا دینی چاہیے
میں پینا چاہتا ہوں مجھ کو پلا دینی چاہیے

اللہ برکتوں سے نوازے گا عشق میں
ہے جتنی پونجی پاس لگا دینی چاہیے

دل بھی کسی فقیر کے حجرے سے کم نہیں
دنیا یہی پہ لا کے چھپا دینی چاہیے

میں خود بھی کرنا چاہتا ہوں اپنا سامنا
تجھ کو بھی اب نقاب اُٹھا دینی چاہیے

میں پھول ہوں تو پھول کو گل دان ہو نصیب
میں آگ ہوں تو آگ بجھا دینی چاہیے

میں تاج ہوں تو تاج کو سر پہ سجائیں لوگ
میں خاک ہوں تو خاک اُڑا دینی چاہیے

میں جبر ہوں تو جبر کی تائید بند ہو
میں صبر ہوں تو مجھ کو دعا دینی چاہیے

میں خواب ہوں تو خواب سے چونکائیے مجھے
میں نیند ہوں تو نیند اُڑا دینی چاہیے

سچ بات ، کون ہے جو سرِ عام کہہ سکے
میں کہہ رہا ہوں مجھ کو سزا دینی چاہیے

○

کھڑے ہیں مجھ کو خریدار دیکھنے کے لیے
میں گھر سے نکلا تھا بازار دیکھنے کے لیے

قطار میں کئی نابینا لوگ شامل ہیں
امیرِ شہر کا دربار دیکھنے کے لیے

ہزار بار ہزاروں کی سمت دیکھتے ہیں
ترس گئے تجھے ایک بار دیکھنے کے لیے

ہر ایک لفظ سے چنگاریاں نکلتی ہیں
کلیجہ چاہیے اخبار دیکھنے کے لیے

جگائے رکھتا ہوں سورج کو اپنی پلکوں پر
زمیں کو خواب سے بیدار دیکھنے کے لیے

عجیب شخص ہے لیتا ہے جگنوؤں سے خراج
وہ اپنی شب کو چمک دار دیکھنے کے لیے

○

تیری ہر بات محبت میں گوارا کر کے
دل کے بازار میں بیٹھے ہیں خسارہ کر کے

ایک چنگاری نظر آئی تھی بستی میں اُسے
وہ الگ ہٹ گیا آندھی کو اشارہ کر کے

آسمانوں کی طرف پھینک دیا ہے میں نے
چند مٹی کے چراغوں کو ستارہ کر کے

میں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہے جس کی
تم نے اچھا ہی کیا مجھ سے کنارہ کر کے

منتظر ہوں کہ ستاروں کی ذرا آنکھ لگے
چاند کو چھت پہ بلا لوں گا اشارہ کر کے

○

آپ کے آتے ہی موسم کو صدا دی جائے گی
ٹہنیوں کو سبز پتّوں کی قبا دی جائے گی

مسکراتا جو ملا اُس کو سزا دی جائے
آنسوؤں کی اِس قدر قیمت بڑھا دی جائے گی

آپ اپنی قبر میں دب جائے گی کاغذ کی لاش
اور یہ دیوار لفظوں کی گرا دی جائے گی

سج رہے ہیں کروٹوں کے پھول میری سیج پر
یہ چِتا بھی صبح سے پہلے بجھا دی جائے گی

اپنی آوازیں سلامت چاہتے ہو تو سنو!
کب تلک بالوں کو ننگی ہواؤں کو صدا دی جائے گی

اب اپنی روح کے چھالوں کا کچھ حساب کروں
میں چاہتا تھا چراغوں کو آفتاب کروں

بتوں سے مجھ کو اجازت اگر کبھی مل جائے
تو شہر بھر کے خداؤں کو بے نقاب کروں

میں کروٹوں کے نئے زاویے لکھوں شب بھر
یہ عشق ہے تو کہاں زندگی عذاب کروں

ہے میرے چاروں طرف بھیڑ گونگے بہروں کی
کسے خطیب میں سمجھوں ، کسے خطاب کروں

اُس آدمی کو بس ایک دُھن سوار رہتی ہے
بہت حسین ہے دنیا ، اِسے خراب کروں

یہ زندگی جو مجھے قرض دار کرتی ہے
کہیں اکیلے میں مل جائے تو حساب کروں

○

اب نہ میں وہ ہوں ، نہ باقی ہے زمانے میرے
پھر بھی مشہور ہے گلیوں میں فسانے میرے

زندگی ہے تو نئے زخم بھی لگ جائیں گے
اب بھی باقی ہے کئی دوست پرانے میرے

آپ سے روز ملاقات کی اُمید نہیں
اب کہاں شہر میں رہتے ہیں ٹھکانے میرے

عمر کے رام نے سانسوں کا دھنوش توڑ دیا
مجھ پہ احسان کیا آج خدا نے میرے

آج جب سو کے اُٹھا ہوں تو یہ احساس ہوا
سسکیاں بھرتا رہا کوئی سرہانے میرے

بڑھ گئی ہے کہ گھٹ گئی دنیا
میرے نقشے سے کٹ گئی دنیا

تتلیوں میں سما گیا منظر
مٹھیوں میں سمٹ گئی دنیا

اپنے رستے بنائے خود میں نے
میرے رستے سے ہٹ گئی دنیا

ایک ناگن کا زہر ہے مجھ میں
مجھ کو ڈس کر پلٹ گئی دنیا

کتنے خانوں میں بٹ گئے ہم تم
کتنے حصوں میں بٹ گئی دنیا

جب بھی دنیا کو چھوڑنا چاہا
مجھ سے آ کر لپٹ گئی دنیا

بے وفا ہو گا ، با وفا ہو گا
اُس سے مل کر تو دیکھ کیا ہو گا

بیر مت پالیے چراغوں سے
دل اگر بجھ گیا تو کیا ہو گا

سر جھکا کر جو بات کرتا ہے
تم سے وہ آدمی بڑا ہو گا

قہقہے جو لٹا رہا تھا کبھی
وہ کہیں چھپ کے رو رہا ہو گا

اُس سے ملنا کہاں مقدر ہے
اور جی بھی لیے تو کیا ہو گا

راحتؔ اک شب میں ہو گئے ہیں رئیس
کچھ فقیروں سے مل گیا ہو گا

O

چاند ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا میرے جام کا ہے
یہ میرا قول نہیں حضرتِ خیام کا ہے

ہم سے پوچھو کہ غزل مانگتی ہے کتنا لہو
سب سمجھتے ہیں یہ دھندا بڑے آرام کا ہے

پیاس اگر میری بجھا دے تو میں مانوں ورنہ
تو سمندر ہے تو ہوگا مرے کس کام کا ہے

اب تیری باری ہے آئینے بچا لے اپنے
میرے ہاتھوں میں جو پتھر ہے ترے نام کا ہے

تیری جلتی ہوئی شمعوں کی لویں کیا دیکھوں
میری آنکھوں میں تو منظر ابھی آسام کا ہے

چاند مہماں میرے مکان میں تھا
میں خدا جانے کس جہان میں تھا

ایک کلی مسکرا کے پھول ہوئی
یہ قصیدہ بھی تیری شان میں تھا

جاتے جاتے یہ آ رہا ہے خیال
جانے کب سے میں اِس جہان میں تھا

دلّی والوں کو کیوں سنا آئے
شعر تو لکھنوی زبان میں تھا

دھوپ کی ایک کرن بھی سہہ نہ سکا
وہ پرندہ جو آسمان میں تھا

ہُو بہ ہُو تم سے ملتا جلتا ہوا
ایک چہرہ ہمارے دھیان میں تھا

○

چاند تیشہ ہے ، زخم رنگت ہے
شاعری کچھ نہیں علامت ہے

پھول کا کھلنا ، کھل کے مرجھانا
سب ترے جسم کی حرارت ہے

آپ کا وار ہو گیا ہے خطا
بچ گیا میں ، مجھے ندامت ہے

شاعر: راحت اندوری

ملنا جلنا تو رسم ہوتی ہے
یہ محبت نہیں مروّت ہے

چھوڑیے بھی دُکھوں سکھوں کا حساب
آپ ملتے ہیں یہ غنیمت ہے

پھر وہی موم سا پگھلتے رہو
اور دو چار دن کی شہرت ہے

شہر میں اب رفاقتیں ہے کہاں
پینے والوں کا دم غنیمت ہے

○

چراغ ڈستی ہوئی آندھیاں بھی آئیں گی
اگر سفر ہے تو دشواریاں بھی آئیں گی

ابھی تو ناؤ کنارے ہے فیصلہ نہ کرو
ذرا بڑھو گے تو گہرائیاں بھی آئیں گی

میں موسموں کا تھکا ہوں مجھے حقیر نہ جان
میرے شجر میں کبھی پتیاں بھی آئیں گی

مجھے قریب سے پڑھ سرسری نظر سے نہ دیکھ
میری کتاب میں دل چسپیاں بھی آئیں گی

الاؤ گاؤں سے باہر رہے تو اچھا ہے
لگے گی آگ تو چنگاریاں بھی آئیں گی

ہم اپنی آنکھوں پہ پٹی تو باندھنے سے رہے
دکان ہے تو یہاں لڑکیاں بھی آئیں گی

مگر فضول رہے کاغذوں کے گل دستے
خیال تھا کہ یہاں تتلیاں بھی آئیں گی

چہرے کو اپنے پھول سے کب تک بچائے گا
یہ آئینہ کبھی نہ کبھی ٹوٹ جائے گا

غنچے اگر ہنسیں گے تو کہلائے گی بہار
میں مسکرا دیا تو نگاہوں میں آئے گا

زخموں کے پھول مہکیں گے جب شام آئے گی
دن ڈوبنے کے ساتھ ہی دل ڈوب جائے گا

معصوم پتیوں کا لہو پی کے سرخ ہے
یہ پھول اب چمن میں کوئی گل کھلائے گا

کتنی اُداس رات ہے راحتؔ کو ڈھونڈیے
وہ مل گیا تو کوئی لطیفہ سنائے گا

○

دل بُری طرح سے دھڑکتا رہا
وہ برابر مجھے ہی تکتا رہا

روشنی ساری رات کم نہ ہوئی
تارا پلکوں پہ ایک چمکتا رہا

چھو گیا جب کبھی خیال تیرا
دل میرا دیر تک دھڑکتا رہا

کل ترا ذکر چھڑ گیا گھر میں
اور گھر دیر تک مہکتا رہا

رات ہم مے کدے میں جا نکلے
گھر کا گھر شہر میں بھٹکتا رہا

اُس کے دل میں تو کوئی میل نہ تھا
میں خدا جانے کیوں جھجکتا رہا

مٹھیاں میری سخت ہوتی گئیں
جتنا دامن کوئی جھٹکتا رہا

○

دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے

موت کا زہر ہے فضاؤں میں
اب کہاں جا کے سانس لی جائے

بس اِسی سوچ میں ہوں ڈوبا ہوا
یہ ندی کیسے پار کی جائے

اگلے وقتوں کے زخم بھرنے لگے
آج پھر کوئی بھول کی جائے

لفظ دھرتی پہ سر پٹکتے ہیں
گنبدوں میں صدا نہ دی جائے

کہہ دو اس عہد کے بزرگوں سے
زندگی کی دعا نہ دی جائے

بوتلیں کھول کے تو پی برسوں
آج دل کھول کر ہی پی جائے

○

دوریاں پاؤں کی تھکن جیسی
اور سیہ رات رہزن جیسی

میرے آنگن میں آ کے ٹھہری تھی
چاندنی تیرے ہی بدن جیسی

مدتوں سے تلاش کرتا ہوں
ایک غزل تیرے بانکپن جیسی

ایک ایک حرف میں ملی مجھ کو
خوبیاں سب تیرے دہن جیسی

غم کے صحرا میں بھاگتے رہیے
زندگی ہو گئی ہرن جیسی

کل گلابوں کے ساتھ پھرتی رہی
ساری خوشبو تیرے دہن جیسی

سوچتا ہوں کہ اِس پہ نظم کہوں
ایک گڑیا مری بہن جیسی

چند لوگوں میں آج بھی راحتؔ
بات ہے مولوی مدن جیسی

○

ایک دن دیکھ کر اُداس بہت
آ گئے تھے وہ میرے پاس بہت

خود سے میں کچھ دنوں سے مل نہ سکا
لوگ رہتے ہیں آس پاس بہت

اب گریباں بہ دست ہو جاؤ
کر چکے اُن سے التماس بہت

کس نے لکھا تھا شہر کا نوحہ
لوگ پڑھ کر ہوئے اُداس بہت

اب کہاں ہم سے پینے والے رہے
ایک ٹیبل پہ ، اک گلاس بہت

تیرے ایک غم نے ریزہ ریزہ کیا
ورنہ ہم بھی تھے غم شناس بہت

کون چھانے لغت کا دریا
آپ کا ایک اقتباس بہت

زخم کی اوڑھنی ، لہو کی قمیص
تن سلامت رہے ، لباس بہت

○

غم سے آ کر گلے خوشی بھی لگے
زندگی ہے تو زندگی بھی لگے

دھوپ جھلسا رہی ہے سارا وجود
سردیوں میں مگر بھلی بھی لگے

تو جو آئے تو صرف شکوے ہو
تو نہ ہو تو تیری کمی بھی لگے

اُس کی آنکھوں کو یاد کر لینا
آپ کو پیاس جب کبھی بھی لگے

وہ کبھی روح میں اُتر آئے
اور کسی روز اجنبی بھی لگے

اشک پلکوں پہ ہوں تو اچھا ہے
شامیانے میں روشنی بھی لگے

ہم نے سیکھی نہیں ہے قسمت سے
ایسی اُردو جو فارسی بھی لگے

○

ہر ایک چہرے کو زخموں کا آئینہ نہ کہو
یہ زندگی تو ہے رحمت ، اِسے سزا نہ کہو

نہ جانے کون سی مجبوریوں کا قیدی ہوں
وہ ساتھ چھوڑ گیا ہے تو بے وفا نہ کہو

تمام شہر نے نیزے پہ کیوں اُچھالا مجھے
یہ اتفاق تھا تم اِس کو حادثہ نہ کہو

یہ اور بات کہ دشمن ہوا ہے آج مگر
وہ میرا دوست تھا کل تک ، اُسے برا نہ کہو

ہمارے عیب ہمیں انگلیوں پہ گنواؤں
ہماری پیٹھ کے پیچھے ہمیں بُرا نہ کہو

میں واقعات کی زنجیر کا نہیں قائل
مجھے بھی اپنے گناہوں کا سلسلہ نہ کہو

یہ شہر وہ ہے جہاں راکشس بھی ہیں راحتؔ
ہر ایک تراشے ہوئے بت کو دیوتا نہ کہو

○

انتظامات نئے سر سے نبھالے جائیں
جتنے کم ظرف ہیں محفل سے نکالے جائیں

میرا گھر آگ کی لپٹوں میں چھپا ہے لیکن
جب مزہ ہے ترے آنگن میں اُجالے جائیں

غم سلامت ہے تو پیتے ہی رہیں گے لیکن
پہلے مے خانے کے حالات سنبھالے جائیں

خالی وقتوں میں کہیں بیٹھ کے رو لیں یارو!
فرصتیں ہیں تو سمندر ہی کھنگالے جائیں

خاک میں یوں نہ ملا، ضبط کی توہین نہ کر
یہ وہ آنسو ہے جو دنیا کو بہا لے جائیں

ہم بھی پیاسے ہیں یہ احساس تو ہو ساقی کو
خالی شیشے ہی ہواؤں میں اُچھالے جائیں

آؤ شہر میں نئے دوست بنائیں راحت
آستینوں میں چلو سانپ بھی پالے جائیں

○

اِس دنیا نے میری وفا کا کتنا اُونچا مول دیا
باتوں کے تیزاب میں میرے من کا اَمرت گھول دیا

جب بھی کوئی انعام ملا ہے میرا نام ہی بھول گئے
جب بھی کوئی الزام لگا ہے مجھ پر لا کر ڈھول دیا

ہاتھ کے چھالے، پاؤں کے کانٹے، آنکھ کے آنسو، دل کا درد
تو نے مجھ کو پیار میں جو بھی تحفہ دیا اَن مول دیا

اب غم آئیں، خوشیاں آئیں، موت آئے یا تو آئے
میں نے تو بس آہٹ پائی اور دروازہ کھول دیا

جتنا خوشی سے رشتہ میرا اتنا غم سے ناتا ہے
میں نے ایک میزان میں اپنا سارا دُکھ سکھ تول دیا

○

جسم کے آر پار ہونا تھا
مجھ کو خود سے فرار ہونا تھا

چاند ہونا تو کوئی بات نہیں
اُس گلی کا غبار ہونا تھا

پھول ہی پھول پاؤں سے سر تک
نام اُس کا بہار ہونا تھا

کتنے دُکھ سکھ ہیں زندگی کے ساتھ
چہرے پہ اشتہار ہونا تھا

اے خدا میری زندگی پہ مجھے
کچھ نہ کچھ اختیار ہونا تھا

تو بتا تو کہاں تلک پہنچا
خیر مجھ کو تو خوار ہونا تھا

شاعری سے بھی مطمئن ہوں مگر
کچھ بڑا کاروبار ہونا تھا

○

جسم میں قید ہے گھروں کی طرح
اپنی بستی ہے مقبروں کی طرح

تو نہیں تھا تو میری سانسوں نے
ظلم ڈھائے ستم گروں کی طرح

اگلے وقتوں کے حافظے اکثر
مجھ کو لگتے ہے نشتروں کی طرح

اور دو چار دن حیات کے ہیں
یہ بھی کٹ جائیں گے سروں کی طرح

کل قفس ہی میں تھے تو اچھے تھے
آج پھرتے ہیں بے گھروں کی طرح

اپنے پھیلاؤں پر اُچھلتا ہے
قطرہ قطرہ سمندروں کی طرح

بن کے صیاد وقت نے راحتؔ
نوچ ڈالا مجھے پروں کی طرح

○

جو کتابوں نے لکھا اُس سے جدا لکھنا تھا
لکھ کے شرمندہ ہوں تجھ کو کہ سوا لکھنا تھا

چاند لکھا ، کبھی سورج ، کبھی موسم لکھا
بات اتنی تھی مجھے نام تیرا لکھنا تھا

تجھ سے ملنے کی تمنا تجھے چھونے کی ہوس
یعنی بہتے ہوئے پانی پہ ہوا لکھنا تھا

میں نے کاغذ پہ صدا دل کی بکھر جانے دی
مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا لکھنا تھا

مرتبہ دل کا ، غزل میری ، قصیدہ اُس کا
کچھ نہ کچھ آج مجھے میرے خدا لکھنا تھا

اُن کے سینوں میں اُجالے نہ اُتارے ہوتے
جن چراغوں کے مقدر میں ہوا لکھنا تھا

پانیوں اور زمینوں کو قدم لکھا ہے
آسمانوں کو مجھے تیری قبا لکھنا تھا

ہے تیرے اک اشارے پہ فنا اور بقا
میرے حق میں بھی تجھے کوئی دعا لکھنا تھا

تیرے اوصاف رقم ہوں یہ کہاں میری بساط
صرف ایک رسم ادا کرنی تھی کیا لکھنا تھا

پھر وہی میرؔ سے اب تک کی دعاؤں کا طلسم
حیف راحتؔ کہ تمہیں کچھ تو نیا لکھنا تھا

جو مال تیرا تھا کل تک وہ اب پرائے کا ہے
یہی رواج مرے شہر کے سرائے کا ہے

اِسی لیے تو مسلسل شکست کھاتے ہیں
ہماری فوج میں سیناپتی کرائے کا ہے

جو دوستوں کی طرح ملتا ہے اندھیرے میں
وہی اُجالا تو دشمن ہمارے سائے کا ہے

دکھائی دیتا ہے جو بھیڑیے کے ہونٹوں پر
وہ لال خون ہماری سفید گائے کا ہے

شریف لوگ بھی راحتؔ سے ملنے جلنے لگے
وہ اب شراب کا عاشق نہیں ہے چائے کا ہے

○

جو میرا دوست بھی ہے، میرا ہم نوا بھی ہے
وہ شخص صرف بھلا ہی نہیں بُرا بھی ہے

میں پوجتا ہوں جسے اُس سے بے نیاز بھی ہوں
مری نظر میں وہ پتھر بھی ہے، خدا بھی ہے

سوال نیند کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی
ہمارے سامنے خوابوں کا مسئلہ بھی ہے

جواب دے نہ سکا اور بن گیا دشمن
سوال تھا کہ تیرے گھر میں آئینہ بھی ہے

ضرور وہ مرے بارے میں رائے دے لیکن
یہ پوچھ لینا کبھی مجھ سے وہ ملا بھی ہے

ملے جو وقت تو ملنے گا ایک دن آکر
مرے بدن میں کوئی، مرے سوا بھی ہے

خانقاہوں میں، حرم میں نہ شوالوں میں ملے
وہ فرشتے جو کتابوں کے حوالوں میں ملے

چاند کو ہم نے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں
اُس سے کہنا کہ کبھی دن کے اُجالوں میں ملے

مسکراہٹ کی صلیبوں پہ چڑھاؤ آنسو
زندگی ایسی گزارو کے مثالوں میں ملے

بھول سے ہونٹوں پہ سقراط کا نام آیا تھا
اور ہم ڈوبے ہوئے زہر کے پیالوں میں ملے

پھر وہی زخم اُبھر آئے جو بھر آئے تھے
آج کچھ خط مجھے بوسیدہ رسالوں میں ملے

میری غزل نے یہ اعزاز دیا ہے مجھ کو
میرے دشمن بھی مرے چاہنے والوں میں ملے

○

خود اپنے آپ کو پہچان لو تو کھولو راز
نگاہ چاہیے خود آئینہ ہے آئینہ ساز

یہی پرانے کھنڈر ہے ہماری تہذیبیں
یہیں پہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

یہاں کے لوگ تو حاکم کے سامنے ہیں فقیر
یہاں نہ اب کوئی محمود ہے نہ کوئی ایاز

ضرور پار اُتاریں گے ایک دن ہم کو
یہ آندھیوں کے سمندر، یہ کاغذوں کے جہاز

بکھر بھی جاؤں لبوں پر تو کھل نہیں سکتا
تری نظر میں چھپا ہے مری غزل کا جواز

بلندیوں کی طلب ہے تو پستیوں میں چلو
سمندروں نے چھپایا ہے برتیوں کا راز

میری غزل میرے سینے کی آگ ہے یارو!
میں کالی داس نہ شیلے، نہ حافظ شیراز

○

خوشی سے دور الم سے قریب لگتے ہیں
تمہارے شہر کے انساں عجیب لگتے ہیں

اک انقلاب نے سب صورتیں بدل ڈالیں
ہمیں اب اپنے ہی چہرے عجیب لگتے ہیں

ستارے جن سے مرا فاصلہ ہے صدیوں کا
کبھی کبھی تو بہت ہی قریب لگتے ہیں

وہ ایک اشارے پر دنیا خرید سکتے ہیں
جو صورتوں سے بہت ہی غریب لگتے ہیں

پیمبروں کا نگر ہے کہ قاتلوں کا نگر
یہاں درخت بھی مجھ کو صلیب لگتے ہیں

مشہور تھے جو لوگ سمندر کے نام سے
آنکھیں ملا نہ پائے مرے خالی جام سے

جھیلوں میں غسل کرتے ہیں رنگیں کنول کے پھول
موسم نے دل میں آگ لگا دی ہے شام سے

اے دل یہ بارگاہ محبت کی ہے یہاں
گستاخیاں بھی ہو تو بہت احترام سے

مرجھا چکے ہیں اب مری آواز کے کنول
میں نے صدائیں دی ہے تجھے ہر مقام سے

کچھ کم نہیں ہے تیرے محلے کی لڑکیاں
آواز دے رہی ہیں مجھے تیرے نام سے

یاد آ رہے ہیں مجھ کو ندؔا فاضلی کے گیت
موسم نے دل میں آگ لگا دی ہے شام سے

○

میرے اپنے مجھے مٹی میں ملانے آئے
اب کہیں جا کے مرے ہوش ٹھکانے آئے

تو نے بالوں میں سجا رکھا تھا کاغذ کا گلاب
لوگ یہ سمجھے بہاروں کے زمانے آئے

چاند نے رات کی دہلیز کو بخشے ہیں چراغ
میرے حصے میں بھی اشکوں کے خزانے آئے

دوست ہو کر بھی مہینوں نہیں ملتا مجھ سے
اُس سے کہنا کہ کبھی زخم لگانے آئے

فرصتیں چاٹ رہی ہیں مری ہستی کا لہو
منتظر ہوں کہ مجھے کوئی بلانے آئے

○

میرے اشکوں نے کئی آنکھوں میں جل تھل کر دیا
ایک پاگل نے بہت لوگوں کو پاگل کر دیا

اپنی پلکوں پر سجا کر میرے آنسو آپ نے
راستے کی دھول کو آنکھوں کا کاجل کر دیا

میں نے دل دے کر اُسے کی تھی وفا کی ابتدا
اُس نے دھوکا دے کے یہ قصہ مکمل کر دیا

یہ ہوائیں کب نگاہیں پھیر لے کس کو خبر
شہرتوں کا تخت جب ٹوٹا تو پیدل کر دیا

دیوتاؤں اور خداؤں کی لگائی آگ نے
دیکھتے ہی دیکھتے بستی کو جنگل کر دیا

زخم کی صورت نظر آتے ہیں چہروں کے نقوش
ہم نے آئینوں کو تہذیب کا مقتل کر دیا

شہر میں چرچہ ہے آخر ایسی لڑکی کون ہے
جس نے اچھے خاصے ایک شاعر کو پاگل کر دیا

○

میری آنکھوں میں قید تھی بارش
تم نہ آئے تو آ گئی بارش

آسمانوں میں کھو گیا سورج
ندیوں میں ٹھہر گئی بارش

پھول پر ، پتیوں پہ ، پلکوں پر
کتنے موتی سجا گئی بارش

گاؤں میں اک مکان بھی نہ بچا
اور سب دیکھتی رہی بارش

تشنگی ڈھونڈتی ہے برسوں سے
نہر، جھرنا، کنواں، ندی، بارش

بیتے لمحوں کی وہ اُمس تھی کہ بس
تیری یاد آئی، آ گئی بارش

ٹھنڈے سورج کی چھاؤں میں بیٹھی
رات بھر کی تھکی ہوئی بارش

آج میکے چلی گئی سیما
کیا خبر تھی کہ آئے گی بارش

میری تقدیر میں ہے ، میرے حوالے ہوں گے
وقت کے ہاتھ میں جو زہر کے پیالے ہوں گے

مسجدیں ہوں گی ، کلیسا نہ شوالے ہوں گے
اتنے نزدیک ، تیرے چاہنے والے ہوں گے

میں اگر وقت کا سقراط بھی بن جاؤں تو کیا
میرے حصے میں وہی زہر کے پیالے ہوں گے

جن چراغوں سے تعصب کا دُھواں اُٹھتا ہے
اِن چراغوں کو بجھا دو تو اُجالے ہوں گے

راہبر جن کو سمجھ رکھا تھا میں نے راحتؔ
کیا خبر تھی کہ وہی لوٹنے والے ہوں گے

○

مسکراہٹ جواب میں رکھنا
آنسوؤں کو نقاب میں رکھنا

زندگی صرف ایک تیری خاطر
روح کب تک عذاب میں رکھنا

میں نے یہ طے کیا نہیں اب تک
زندگی کس حساب میں رکھنا

ٹھوکریں ، ظلمتیں ، ستم ، آنسو
ساری باتیں حساب میں رکھنا

میں نے احمد فرآز سے سیکھا
پھول لے کر کتاب میں رکھنا

جام دکھ کا ہو چاہے سکھ کا ہو
غرق مجھ کو شراب میں رکھنا

تم کو پہچانتا نہیں کوئی
پھر بھی چہرہ نقاب میں رکھنا

○

راستہ بھول گیا کیا اِدھر آنے والا
اب تو یہ صبح کا تارا بھی ہے جانے والا

یاد کے پھول کو پلکوں پہ سجا کے رکھنا
یہ مسافر ہے بہت دُور سے آنے والا

آپ اُس شخص سے واقف تو ہیں، کم واقف ہیں
وہ مسیحا ہے مگر زخم لگانے والا

اجنبی شہر سے مایوس نہ ہو، چل تو سہی
مل نہ جائے گا کوئی زخم لگانے والا

جسم میں سانس تھی جب تک، وہ مخالف ہی رہا
میرا دشمن تھا مگر ساتھ نبھانے والا

سمندروں پہ کوئی شہر بسنے والا ہے
دماغ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا ہے

یہ آج راہ میں پتھر کا ڈھیر کیسا ہے
ضرور کوئی پیمبر اِدھر سے گزرا ہے

عزیزو! آج بھی آنکھیں مری وہی ہیں مگر
اب اِن میں تم نہیں رہتے ہو خون رہتا ہے

جو پتھروں سے بتوں کو تراشتا تھا کبھی
اُس آدمی کا سلوک اب بتوں ہی جیسا ہے

میں اپنے عہد کی تاریخ جب بھی پڑھتا ہوں
ہر ایک لفظ مجھے مرثیہ سناتا ہے

وہ میری جان کا دشمن سہی مگر راحتؔ
کبھی کبھی تو میرے شعر گنگناتا ہے

○

شہر میں ڈھونڈ رہا ہوں کہ سہارا دے دے
کوئی حاتم جو میرے ہاتھ میں کاسہ دے دے

پیڑ سب ننگے فقیروں کی طرح سہمے ہیں
کس سے اُمید یہ کی جائے کہ سایہ دے دے

وقت کی سنگ زنی نوچ گئی سارے نقوش
اب وہ آئینہ کہاں جو مرا چہرہ دے دے

دشمنوں کی بھی کوئی بات تو سچ ہو جائے
آ مرے دوست! کسی دن مجھے دھوکا دے دے

میں بہت جلد ہی گھر لوٹ کے آجاؤں گا
میری تنہائی یہاں کچھ دنوں پہرہ دے دے

ڈوب جانا ہی مقدر ہے تو بہتر ورنہ
تو نے پتوار جو چھینی ہے تو تنکا دے دے

جس نے قطروں کا بھی محتاج کیا ہے مجھ کو
وہ اگر جوش میں آ جائے تو دریا دے دے

تم کو راحتؔ کی طبیعت کا نہیں اندازہ
وہ بھکاری ہے مگر مانگو تو دنیا دے دے

○

تیرگی چاند کے زینے سے سحر تک پہنچی
زلف کاندھے سے جو اُتری تو کمر تک پہنچی

میں نے پوچھا تھا کہ یہ ہاتھ میں پتھر کیوں ہے
بات جب آگے بڑھی تو مرے سر تک پہنچی

میں تو سویا تھا مگر بارہا تجھ سے ملنے
جسم سے آنکھ نکل کر ترے گھر تک پہنچی

تم تو سورج کے پجاری ہو تمھیں کیا معلوم
رات کس حال میں کٹ کٹ کے سحر تک پہنچی

ایک شب ایسی بھی گزری ہے خیالوں میں ترے
آہٹیں جذب کیے رات سحر تک پہنچی

تیری آنکھوں کی حد سے بڑھ کر ہوں
دشت میں آگ کا سمندر ہوں

کوئی تو میری بات سمجھے گا
ایک قطرہ ہوں اور سمندر ہوں

توڑ ڈالا ہے جسم کا زندان
آج میں اپنے گھر کے باہر ہوں

جھوٹ کے نرک میں نہ ڈال مجھے
لوگ کہتے ہیں میں یودھشٹر ہوں

میں بھی ایک منجمد صدا ہوں مگر
خیر سے گنبدوں کے باہر ہوں

میری گردن میں بھی ہے غم کے ناگ
میں بھی اپنے سمئے کا شنکر ہوں

○

یہ جو ہر سو ، فلک منظر کھڑے ہیں
نہ جانے کس کے پیروں پر کھڑے ہیں

تُلا ہے دھوپ برسانے پہ سورج
شجر بھی چھتریاں لے کر کھڑے ہیں

اِنہیں ناموں سے میں پہچانتا ہوں
میرے دشمن میرے اندر کھڑے ہیں

کسی دن چاند نکلا تھا یہاں سے
اُجالے آج بھی چھت پر کھڑے ہیں

جلوس آنے کو ہے دیدہ وروں کا
نظر نیچی کیے منظر کھڑے ہیں

اُجالا سا ہے کچھ کمرے کے اندر
زمین و آسماں باہر کھڑے ہیں

○

زندگی تیری آس رکھتی ہے
یہ نبولی مٹھاس رکھتی ہے

زندگی آگ کی صلیبوں پر
کاغذوں کے گلاس رکھتی ہے

تجربوں کو ہے بارشیں درکار
عمر چڑیوں کی پیاس رکھتی ہے

موت اپنے بدن پہ کچھ دن تک
زندگی کا لباس رکھتی ہے

تیرگی خوش نما اُجالوں کے
دائرے آس پاس رکھتی ہے

اُس کے سینے سے آگ نکلے گی ،
جو زمیں خشک گھاس رکھتی ہے

○

زندگی عمر سے بڑی تو نہیں
یہ کہیں موت کی گھڑی تو نہیں

یہ الگ بات ہم بھٹک جائیں
ویسے دنیا بہت بڑی تو نہیں

ٹوٹ سکتا ہے یہ تعلق بھی
عشق ہے کوئی ہتھکڑی تو نہیں

آتے آتے ہی آئے گی منزل
راستے میں کہیں پڑی تو نہیں

ایک دھڑکا سا ہے بچھڑنے کا
یہ ملاقات کی گھڑی تو نہیں

ایک جنگل ہے دُور دُور تلک
یہ مرے شہر کی کڑی تو نہیں

کتنی پی ، کیسے کٹی رات ، مجھے ہوش نہیں
رات کے ساتھ گئی بات ، مجھے ہوش نہیں

مجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ جانا ہے کہاں
تھام لے کوئی میرا ہاتھ ، مجھے ہوش نہیں

آنسوؤں اور شرابوں میں گزر ہے اب تو
میں نے کب دیکھی تھی برسات ، مجھے ہوش نہیں

دیکھ سکتے ہو مجھے چھو کے اک انسان ہوں میں
پوچھتے کیا ہو مری ذات ، مجھے ہوش نہیں

جانے کیا ٹوٹا ہے پیمانہ کہ دل ہے میرا
بکھرے بکھرے ہیں خیالات ، مجھے ہوش نہیں

○

رات میں کون وہاں جائے جہاں آگ لگی
صبح اخبار میں پڑھ لیں گے، کہاں آگ لگی

آگ سے آگ بجھانے کا عمل جاری تھا
ہم بھی پانی لیے بیٹھے تھے، جہاں آگ لگی

وہ بھی اب آگے بجھانے کو چلے آئے ہیں
جن کو یہ بھی نہیں معلوم، کہاں آگ لگی

صبح تک سارے نشانات مٹا ڈالیں گے
کوئی پوچھے گا تو کہہ دیں گے، کہاں آگ لگی؟

کس کو فرصت تھی جو دیتا کسی آواز پہ دھیان
چیختا پھرتا تھا آوارہ دُھواں آگ لگی

O

کہیں اکیلے میں مل کر جھنجھوڑ دوں گا اُسے
جہاں جہاں سے وہ ٹوٹا ہے جوڑ دوں گا اُسے

مجھے وہ چھوڑ گیا یہ کمال ہے اُس کا
اِرادہ میں نے کیا تھا کہ چھوڑ دوں گا اُسے

بدن چُرا کے وہ چلتا ہے مجھ سے شیشہ بدن
اُسے یہ ڈر ہے کہ میں توڑ پھوڑ دوں گا اُسے

پسینے بانٹتا پھرتا ہے ہر طرف سورج
کبھی جو ہاتھ لگا تو نچوڑ دوں گا اُسے

مزہ چکھا کہ ہی مانا ہوں میں بھی دنیا کو
سمجھ رہی تھی کہ ایسے ہی چھوڑ دوں گا اُسے

○

تجلیوں کا نیا دائرہ بنانے میں
مرے چراغ لگے ہیں ہوا بنانے میں

مری نگاہ میں وہ شخص آدمی بھی نہیں
لگا ہے جس کو زمانہ خدا بنانے میں

اَڑے تھے ضد پہ کہ سورج بنا کے چھوڑیں گے
پسینے چھوٹ گئے ایک دیا بنانے میں

یہ چند لوگ جو بستی میں سب سے اچھے ہیں
اِنہیں کا ہاتھ ہے مجھ کو بُرا بنانے میں

ابھی اِنہیں نہ پریشاں کروں مسیحاؤ!
مریض اُلجھے ہوئے ہیں دوا بنانے میں

○

سُلا چکی تھی یہ دنیا تھپک تھپک کے مجھے
جگا دیا تری پازیب نے کھنک کے مجھے

کوئی بتائے کہ میں اِس کا کیا علاج کروں
پریشاں کرتا ہے یہ دل دھڑک دھڑک کے مجھے

تعلقات میں کیسے دراڑ پڑتی ہے
دکھا دیا کسی کم ظرف نے چھلک کے مجھے

ہمیں خود اپنے ستارے تراشنے ہوں گے
یہ ایک جگنو نے سمجھا دیا چمک کے مجھے

بہت سی نظریں ہماری طرف ہیں محفل میں
اشارہ کر دیا اُس نے ذرا سرک کے مجھے

میں دیر رات گئے جب بھی گھر پہنچتا ہوں
وہ دیکھتی ہے بہت چھان کے پھٹک کے مجھے

○

آج ہم دونوں کو فرصت ہے چلو عشق کریں
عشق دونوں کی ضرورت ہے چلو عشق کریں

اِس میں نقصان کا خطرہ ہی نہیں رہتا ہے
یہ منافع کی تجارت ہے چلو عشق کریں

یہ مہکتی ، یہ تھرکتی ، یہ چمکتی دنیا
عشق والوں کی بدولت ہے چلو عشق کریں

آپ ہندو ، میں مسلمان ، یہ عیسائی ، وہ سکھ
یار چھوڑو یہ سیاست ہے ، چلو عشق کریں

دیوتاؤں نے جو بخشا ہے وہ وردان ہے عشق
عشق نبیوں کی وراثت ہے ، چلو عشق کریں

O

انصاف ظالموں کی حمایت میں جائے گا
یہ حال ہے تو کون عدالت میں جائے گا

دستار نوچ ناچ کے احباب لے اُڑے
سر بچ گیا ہے یہ بھی شرافت میں جائے گا

دوزخ کے انتظام میں اُلجھا ہے رات دن
دعوا یہ کر رہا ہے کہ جنت میں جائے گا

خوش فہمیوں کی بھیڑ میں تو بھول کیوں گیا
پہلے مرے گا بعد میں جنت میں جائے گا

واقف ہے خوب جھوٹ کے فن سے یہ آدمی
یہ آدمی ضرور سیاست میں جائے گا